شبچراغ

صادق ضیا ۔ بی ۔ اے

شبچراغ کے افسانے

(۱) میرے افسانے (پیش لفظ) ۳
(۲) حسین مغالطہ ۶
(۳) ...اِزم ۲۰
(۴) منزل کا تعاقب ۲۷
(۵) آئینے میں ۴۴
(۶) غلطیوں کی ایک رات (مزاحیہ) ۴۹
(۷) چراغِ ساحل ۶۰
(۸) گیتی آرا ۶۶
(۹) نووارد روح ۷۳

محمد صادق ضیا چنیوٹوی بی۔ اے (ایل ایل بی فائنل) نے

رفاہِ عام پریس آگرہ میں چھپوا کر

قصر الادب آگرہ سے شائع کیا

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے افسانے

اگر آپ ان افسانوں میں حسن و عشق، جنگ و جدال اور پلاٹ کا الجھاؤ دیکھنے کے متمنی ہوں تو میں آپ کو رائے دوں گا کہ آپ اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے ہی رکھ دیں۔ یہ صحیح ہے کہ افسانوں کا موضوع بالعموم محبت ہوتا ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی زندگی میں ایک ایسا دور بھی آتا ہے جس میں محبت سے متعلق سوالات ہی پیدا نہیں ہوتے اور ان افسانوں کے لکھنے وقت میرے ذہن میں انسانی زندگی کا وہی دور تھا۔ یہ کردار روزانہ زندگی ہی سے لئے گئے ہیں۔ اور اکثر عنصر محبت کے فقدان کے باوجود زندگی کی نیرنگیوں سے لبریز ہیں اگر بغور دیکھا جائے تو واضح ہو گا کہ یہ افسانے تمثیلِ حیات کے چند مناظر ہیں ان میں جو کردار کام کر رہے ہیں وہ حقیقی ہیں اور میں اپنی زندگی میں کسی نہ کسی

نیرنگِ انقلاب ہیں راتیں بہار کی
صبحِ چمن کو روز اک افسانہ چاہیئے

(سیمابؔ)

یہی خصوصیت شیکسپیئر کے یہاں ہیملٹ کا کریکٹر بن جاتی ہے۔ یہ صورتِ حالات انسانی خواہشات کے کتنی ہی خلاف کیوں نہ ہو دنیا میں ایسے اشخاص کا وجود بھی ہے جو ہیملٹ کے کردار میں اپنے خیالات کی نمائندگی محسوس کرتے ہیں۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں تو اس کو بھی پریشان خیالی ہی کا ایک پہلو سمجھنا چاہئے۔

آپ دیکھیں گے کہ بیشتر افسانوں میں ایک ہی کردار کام کر رہا ہے۔ "سلیم" کے پیرہن میں میں نے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اور سلیم کی زندگی میری تخیلی زندگی ہے۔ سلیم میرا ذہنی کردار ہے۔ جب کبھی میں دنیا کی الجھنوں سے الگ ہو کر انسانی زندگی اور اپنے لائحہ عمل پر غور کرتا ہوں تو میرے ذہن میں خود میرا وجود ایک تمثیل کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں میں خود کو اپنی ذات سے الگ دیکھتا ہوں۔ اور یہی سلیم کے کردار کا مقصد ہے۔

اگر آپ کو میری متذکرہ عرضداشت سے اتفاق ہی تو بیشک آپ اِن افسانوں کو پڑھنا شروع کیجئے ورنہ ....

آگرہ۔ یکم ستمبر ۱۹۳۶ء —— محمد صادق ضیا

حیثیت سے اُن سے وابستہ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ان افسانوں کی ترتیب میں دل سے زیادہ دماغ کو تعلق ہے۔ جب کوئی انسان اپنے اعمال میں دماغ کو غالب کر لیتا ہے تو وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو مختلف طور پر ان افسانوں میں دکھائی گئی ہے محبت میں دماغ کو دخل نہیں، دل کو ہے۔ دل سوچ بچار کی فرصت نہیں دیتا اور ان افسانوں میں سوائے سوچ بچار کے اور کچھ نہیں۔

لیکن میں نے آپ کے ذوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان میں بعض افسانے ایسے ہیں جو مجھے پسند ہیں، اور بعض ایسے جنہیں آپ پسند کریں گے۔ آپ کی پسند اور اپنی پسند کے متعلق میں بحث کرنا لاحاصل سمجھتا ہوں اور اس بات کا فیصلہ ان افسانوں پر چھوڑتا ہوں۔ جو افسانہ پسند نہ آئے اُسے میرے ذوق پر محمول کیجئے اور جسے آپ پسند کریں اسے اپنے مذاقِ طبیعت پر۔

دو باتیں آپ ان افسانوں میں نئی ملاحظہ فرمائیں گے وہ یہ کہ افسانوں کی بنیاد کسی مسلسل پلاٹ پر نہیں رکھی گئی ہے۔ دماغ کی تخیل ہی ہر افسانے کا پلاٹ ہے۔ اور وہی ہر افسانے کا مآل۔ جہاں کہیں کوئی کردار کسی موقع پر کام کرتا دکھایا گیا ہے۔ وہاں وہ واقعہ ضمنی ہے اور یہی سبب ہے کہ افسانے پڑھنے کے بعد ضمنی واقعے کا خیال ذہن سے محو ہو جاتا ہے اور بعد میں ذہن اسی تخیل پر مصروفِ غور ہو جاتا ہے۔ جو ہر افسانے کی تہ میں موجود ہے اور جو میرا مقصد تھا۔

بعض افسانوں کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اُن کا انجام المیہ نظر آتا ہے۔ میرے لمحاتِ زندگی بیشتر سوچ بچار میں صرف ہوئے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں عملی انسان نہیں ہوں

مرد ہوتے ہیں۔ یہ مرد عورت کی شان میں یوں تو قصیدے کے قصیدے لکھ جاتے ہیں لیکن جب حسن پر اُنھیں اختیار مل جاتا ہے تو وہ اپنی شاعری بھول جاتے ہیں۔ عورت کو ایک شکار اور ایک مجرم سمجھ کر گھر کی چار دیواری میں ہمیشہ کے لیئے پابہ زنجیر کر دیتے ہیں۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ حسنِ آزاد کو قید کرنے کا اُنھیں کیا حق ہے۔ مرد کیوں نہ گھروں میں بیٹھا دیئے جائیں۔؟ اور عورتیں کیوں نہ مردوں پر حکمرانی کریں"؟

"استغفر اللہ" سلیم نے رسالہ پھر زور سے پھینک دیا۔ وہ اپنے تنہا کمرے میں شیر کی طرح للکار کر بولا" ایسا نہیں ہو سکتا۔ مرد فطرتاً عورت پر قادر ہے۔ عورت مرد کے التفات کی بھکارن ہے۔ عورت مرد کے قوی ہاتھوں میں ایک نازک کھلونا ہے اور عورت مرد کے باغِ شباب کی ایک کمزور تیتری ہے۔ میں کل ہی لکھوں گا اور چلینج دوں گا کہ یہ مضمون نگار عورت مرد کے خلاف پوری قوتِ تحریر سے میرے سامنے آئے، میں اس کے ایک ایک حملے کو رد کروں گا اور اُسے بتا دوں گا کہ مرد مرد ہے اور عورت عورت" سلیم ایک بلند فطرت، کبھی نہ جھکنے والا اور طباع نوجوان تھا۔ اُس نے دوسرے ہی دن مضمون نگار خاتون کو مدیرِ رسالہ کے واسطے سے یہ خط لکھ دیا۔

"تم عورت ہو اس لئے مرد کے فطری رجحانات سے واقف نہیں ہو۔ مردوں کی بیوفائی اور خود اختیاری عورت کی کمزوری اور خود نمائی کا نتیجہ ہے عورت ہو کر مردوں کے خلاف جہاد نہ کرو۔ آخر تمہیں بھی کبھی کسی مرد سے واسطہ پڑے گا۔ اُس وقت اگر تمہاری تحریر تمہارے سامنے رکھدی گئی تو کیا کرو گی؟ عورت کا غرور مرد سے ہے۔ مرد کارزارِ ہستی کا ایک حوصلہ مند ہیرو ہے۔ اُس کے

حسین مغالطہ

سلیم نے آرام کرسی سے اُٹھ کر میز پر زور سے ایک رسالہ پھینکتے ہوئے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ" اب ہر عورت اس قابل ہو گئی کہ وہ مردوں پر، مردوں کے کریکٹر پر، مردوں کی معاشرت پر، اور مردوں کی طینت و فطرت پر جن الفاظ میں چاہے حملہ کر دے۔ میں اس مضمون کا جواب ضرور دوں گا۔" اُس نے رسالہ پھر اُٹھا لیا۔ اور لیمپ سے ذرا قریب ہو کر استہزا سے پڑھنے لگا۔

"...... مرد اپنے پُرشوکت الفاظ سے عورتوں کو سبز باغ دکھا کر اپنا دیوانہ بنا لیتے ہیں مگر جب ازدواجی زندگی پر انھیں غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ عورت کو ایسا پھول سمجھتے ہیں جسے مسل کر پھینک دینا گویا عشرتِ حیات ہے ...... مجھے اگر ایسا موقع ملا تو میں بتا دوں گی کہ عورت پامال ہونے کیلئے نہیں پامال کرنے کیلئے ہے۔ مسلے جانے کیلئے نہیں مسلنے کیلئے ہے۔ اور برباد کئے جانے کے لئے نہیں، برباد کرنے کیلئے ہے۔"

"برباد کرنے کیلئے ہے" سلیم نے ہونٹ چبا کر اس فقرہ کو دہرایا اور رسالہ پھر میز پر پھینکدیا۔ وہ کچھ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتا ہوا کچھ دیر ٹہلا۔ اس کے بعد رسالہ پھر اُٹھا لیا۔ پھر پڑھنے لگا۔

"عورت حسن ہے۔" حسن شاعر کا شاہکار اور موضوعِ جمیل ہے۔ شاعر عموماً

تو سر آنکھوں پر، ورنہ نا آشنائے محبت مردوں سے اس دنیا کو بہت جلد خالی ہو جانا چاہیئے۔ میں یہ کوشش کروں گی، آپ میری کامیابی دیکھیں گے۔ کیا فرمایا، میں اعترافِ شکست کر لوں گی! بالکل درست۔ کیوپڈ اسی دم خم اور ایسی ہی لن ترانی کے ساتھ "سائکی" کے سامنے آیا تھا۔ مگر آپ نے دیکھا، نتیجہ کیا ہوا۔؟ لنگ ——ڑا —— ہو گیا۔ میں قہقہہ لگا رہی ہوں۔ آپ بھی ہنسیئے —— حضورِ والا عورت کی شکست حسن کی شکست ہے۔ حسن کی شکست فطرت کی شکست ہے اور فطرت کی شکست دنیا کی تباہی و بربادی ہے۔۔ میں اجازت دیتی ہوں، آپ تیر آزمائیے اور ہو سکے تو ساری دنیا کو تباہ کر دیجئے۔"

"خ۔ب"

سلیم سمجھا تھا کہ عورتوں کی حمایت لینے والی، معاشرتی رسم و رواج کی زنجیریں توڑنے والی خ۔ب کوئی معمولی عورت ہو گی جو اس کے لفظوں کے دباؤ میں آ کر اپنی روشِ خیال بدل دے گی۔ لیکن خ۔ب کے پہلے ہی خط نے اس کا خیال بدل دیا۔ اس نے یہ خط کوئی دس مرتبہ پڑھا اور ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ الفاظ کی نشست، بیان کی قوت، دعوے کی مضبوطی، بے خوفی، بے تکلفی، صداقت پرستی، سخن پروری" غرضکہ ایک خط میں اسے اتنے جوہر نظر آئے کہ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

وہ فریقِ مقابل کے سامنے اپنے خیالات کو شکست خوردہ تسلیم کرنے لگا۔ اس کے دل میں خ۔ب کی عزت و عظمت کے ساتھ ایک قسم کی دلبستگی بھی پیدا ہونے لگی۔ وہ مسئلہ معاشرت پر غور کرنے کے بجائے یہ سوچنے لگا کہ ایسی عورت کیلئے مرد کیسا ہونا چاہیئے۔؟ کیا وہ مرد خوش نصیب نہیں ہے جسے ایسی عورت ملی؟

مقابلے میں ناز و ادا کا کمزور لشکر لے کر نہ اٹھو۔ عورت نے ہمیشہ مرد سے شکست کھائی ہے۔ اگر تمہیں بھی اپنی شکست منظور ہے تو سب سے پہلے اس میدان میں مقابلے کیلئے میں موجود ہوں اپنے دلائل کا ترکش خالی کر دو، اور دیکھو کہ میرا دعویٰ کہاں تک صحیح اور اٹل رہتا ہے۔ اور بالآخر تم کس طرح اعتراف شکست کر کے میرے قدموں پر گر پڑتی ہو.....''

سلیم کا خیال تھا کہ اس کے خط کا جواب رسالے کے ذریعے یا مدیر رسالہ کے ذریعے اس تک پہونچے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ کچھ روز کے بعد خ۔ ب کا خط مدیر رسالہ کے توسط سے اس کے پاس پہونچ گیا اس نے لفافہ جلدی جلدی چاک کیا۔ خط کھولا اور پڑھنے لگا:۔

''.....کیا مردوں کی نمائندگی کرنے والوں کی تہذیب ایسی ہی ہوتی ہے کہ نامہ اولین میں ہی جی بھر کر گالیاں دے لیں۔ خدا نہ کرے کہ میرا کسی مرد سے واسطہ ہو۔ لیکن میں آپ کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ اگر ایسا ہوا تو میں عورت کے مضبوط کردار کا ثبوت دونگی اور مردوں کی ان تمام غیر انسانی خود داریوں کو اپنے تلووں سے کچل ڈالوں گی: جو چاہتے ہیں کہ عورت کا سر مرد کے پاؤں پر جھکا رہے۔ کیا عورت انسان نہیں؟ کیا عورت کے پہلو میں دل نہیں ہے۔؟ کیا اسکی خوبصورتی اور اس کا عورت پن صرف اس لئے ہے کہ مردوں کی خود غرضی و عیش پرستی کی بھٹی میں جھونک دیا جائے؟ ہوش کی لو، سلیم ہوش کی لو، شاید کسی عورت سے پالا نہیں پڑا۔ ورنہ تکیے پر سر لئے بیٹھے نظر آتے۔ عورت مرد کی پرستار نہیں ہے۔ محبت کی پرستار ہے۔ اگر محبت مرد بن سکتی ہے

منصوری کی برف ریز اور بہار خیز چوٹیاں اُنھیں دعوتِ سیر دے رہی تھیں۔ سلیم اپنے چھوٹے بھائی شمیم کے ساتھ سیکنڈ کلاس میں بیٹھ گیا۔ اور اسی سے متصل خواتین کو بٹھا دیا رات ٹرین کی موسیقی آمیز صداؤں سے گونجتی ہوئی ختم ہو گئی۔ سہارنپور پہ صبح ہوئی۔ تو سلیم زنانہ ڈبے کے پاس جا کر پوچھنے لگا " آیا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے ؟ "

دریچے کے ایک گوشے سے بجلی چمکی۔ چاند کی دو قاشیں، دو ناگنیں، ایک ہی جگہ نظر آئیں۔ سلیم جواب لینا بھول گیا۔ اس کے دل نے سوال کیا۔ یہ کون ؟ آیا نے جواب دیا۔ " اچھے پان یہاں مل جائیں تو بھجوا دو۔ اور ناشتہ لے جاؤ " سلیم نے ملازم کو پان والے کی تلاش میں بھیجا اور ایک جلوۂ دیدہ و نادیدہ کے اشتیاق میں پھر دریچے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

گارڈ نے سیٹی دی۔ ٹرین حرکت میں آگئی۔ سلیم چونکا اور چلتی گاڑی میں بمشکل سوار ہوا۔ اُس کا دل زنانہ ڈبے کی طرف کھنچ رہا تھا وہ ناشتہ کرنا بھول گیا۔ جی چاہتا تھا کہ زنجیر کھینچ کر ٹرین کو ٹھہرا لے۔ خدا خدا کر کے دوسرا اسٹیشن آیا۔ سلیم کا دل اُچھلنے لگا وہ بے اختیار ہو کر پھر اُترا۔ اور دریچے کے پاس جا کر اس نے پھر کہا۔ " آیا کسی چیز کی ضرورت ہے؟ "

ایک نسک آواز کسی قدر مسرت لئے ہوئے اُس کے کانوں میں آئی " آپ کی " زنانہ ڈبہ قہقہے سے گونج اُٹھا۔ اور سلیم نے دریچے سے جھانک کر اچھی طرح دیکھ لیا کہ وہی بجلی جو براہِ راست اُس کے دل پر گری تھی، خس کے پنکھے کی اوٹ لئے ہوئے مسکرا رہی ہے۔

ٹرین پھر روانہ ہوئی تو خواتین میں سلسلۂ گفتگو شروع ہوا۔

" یہ آپ کے کون ہیں ؟ "

یکایک وہ چونکا۔ اُس نے خط پھر پڑھا۔ "شاید کسی عورت سے پالا نہیں پڑا" "اپنے تلوؤں سے کچل ڈالوں گی" کیا ایک حسین و نازک عورت کا کردار یہی ہونا چاہئے ——— یہ تو کوئی تجربہ کار بڑھیا معلوم ہوتی ہے ——— نہیں، اس میں لکھا ہے۔ "خدا نہ کرے کہ میرا کسی مرد سے واسطہ ہو" پھر طرزِ تحریر سے جوانی، نہیں نوجوانی ٹپکتی ہے۔ کیا قہقہہ کوئی بڑھیا لگا سکتی ہے؟ ——— "میں کوشش کروں گی کہ دنیا ایسے مردوں سے خالی ہو جائے۔"

جوان قطعاً جوان، دوشیزہ واقعی دوشیزہ۔

سلیم پھر چونکا۔ وہ دوسرے ہاتھ کی مٹھی باندھ کر خط کی طرف جھکا۔ اُس نے کہا "تو کیا مجھے اعترافِ شکست کر کے عذر خواہی کر لینی چاہئے؟ ——— نہیں نہیں ایسا نہ ہو گا۔ ایسا کبھی نہ ہو گا۔

مدیرِ رسالہ کے توسط سے سلسلۂ مکاتبت کا انجام سلیم کیلئے نہایت خوشگوار رہا۔ ایک محبت ناآشنا دل میں میٹھی میٹھی کسک سی پیدا ہونے لگی۔ دوسری طرف بھی اس کا اثر ضرور ہوا مگر اعترافِ شکست کیلئے دونوں میں سے کوئی مجبور نہ تھا۔ اس لئے بات یہاں آ کر ختم ہو گئی کہ "ہم عورت کا اور آپ مرد کا عملی تجربہ کریں"

۲

پورے چھ ماہ بعد گرمیوں کے موسم میں، رات کو دس بجے سلیم اپنے پورے خاندان کے ساتھ اسٹیشن پر تھا۔ سلیم کے والد کے سوائے گھر کا ہر فرد اس قافلے میں موجود تھا

"ہونا بھی یہی چاہیئے۔ آج کل زمانے کا یہی رنگ ہے"

"میں آپ سے مل کر بہت مسرور ہوئی۔"

"میں بھی آپ کے اخلاق اور خلوص سے مسحور ہو چکی ہوں۔"

"خالدہ نے ایک معنی خیز نگاہ سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہمشیرہ سلیم کے پاس آ بیٹھیں۔ دونوں میں کچھ آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں۔ اسٹیشن آیا۔ سلیم پھر جلوہ گاہِ حُسن کی حسین مسافرہ کی طرف لپکا۔ جسکی نگاہیں بڑی دیر سے اُسکی متجسس تھیں۔ سلیم کی آپا نے سلیم کو آواز دی۔ "یہاں آنا" اس نے "جی" کہکر اپنا سر دریچے میں ڈال دیا۔ حُس کا پنکھا آنکھوں سے نیچے رنگین لبوں کو دبائے حجابِ حُسن بنا ہوا تھا۔

"اب دہرہ دون کتنی دور ہوگا۔"

"دو اسٹیشن اور باقی ہیں۔ غالباً آپ سفر سے گھبرا گئی ہوں گی۔"

"نہیں ایسی تو نہیں گھبرائی۔ ابھی تو صبح کا وقت ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں آرہی ہیں۔"

"یہ منصوری کی پیغمبر ہیں۔"

خالدہ نے مسکرا کر کہا۔ "پیغمبر تو مرد ہوتے ہیں۔ ہوا کو خداوندۂ منصوری کیوں نہ کہیئے۔" سلیم کچھ جھینپ سا گیا۔ اُسکی آپا ہنسیں اور بولیں "جواب دو سلیم" گارڈ نے سیٹی دی اور سلیم نے یہ کہتے ہوئے دریچے سے اپنا سر نکال لیا کہ "خداوندہ تو آپ کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ ہوائیں اُنھیں کی پیغمبری کر رہی ہیں۔۔۔۔۔"

ہمشیرۂ سلیم و خالدہ میں پھر ایک طویل گفتگو ہوئی۔ ایک قافلہ دہرہ دون اُتر گیا دوسرا قافلہ لکھنؤ چلا گیا۔ ؟

"یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اسی سال بی ۔ اے کا امتحان دیا ہے۔ اب تعطیلات میں ہمارے ساتھ منصوری جا رہا ہے۔ شاعر بھی ہے اور ادیب بھی۔"

"کہیں شادی ہو گئی ہے ؟"

"ابھی نہیں۔ لیکن اباجان کا ارادہ ہے کہ اسی سال سردیوں تک شادی سے فارغ ہو جائیں"

"آپ کے یہاں کیا کاروبار ہوتا ہے"

"جی والد صاحب لاہور میں انسپکٹر مدارس ہیں۔ تمام گھر کی عورتیں اور بچے تعلیم یافتہ ہیں یا تعلیم پا رہے ہیں"

"تو ایسے گھر کیلئے بہو بھی تعلیم یافتہ ہی ہونی چاہیئے۔"

"اور کیا ؟ آپ کے بزرگ کیا کرتے ہیں ؟"

"والد صاحب تعلقہ دار ہیں۔ اسی ہزار کا ایک تعلقہ ضلع انبالہ میں ہے اور کوئی دس ہزار کی جائداد امرتسر میں"

"خوب۔ یہ صاحبزادی ..... ؟"

"یہ میری چھوٹی بہن خالدہ ہے۔ ایف۔ اے کا امتحان دے چکی ہے۔ مضمون نگاری سے اسے خاص دلچسپی ہے۔ آپ نے ہندوستان کے مشہور زنانہ رسالوں میں اور اکثر انگریزی رسالوں میں اس کے مضامین پڑھے ہوں گے"

"ان کی بھی غالباً شادی نہیں ہوئی۔"

"جی ہاں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں اپنی مرضی کے مطابق شادی چاہتی ہیں۔ وہ قدیم رسم و رواج کی پابند نہیں ہوتیں۔"

"یہ ردادری کا پوچھنا مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا"

"تو کیا میں اپنی تفریح کو تمہارے بھائی کی علالت پر قربان کر دوں؟"

"تو کیا میں اپنے بھائی کو تمہاری تفریح کی بھینٹ چڑھا دوں؟"

"بھائی کے پُرسانِ حال اور بہت ہیں۔ تمہارا فرض میری اطاعت ہے۔"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ لیکن....."

"لیکن کچھ نہیں۔ تمہیں ساتھ چلنا ہوگا۔"

"میں مرد کی اتنی پابند نہیں ہو سکتی؟۔"

"پھر کیا چاہتی ہو؟۔"

"آزادی"

"کیا قیدِ نکاح سے؟"

"جی نہیں زندانِ غرض سے"

"شوہر کی "غرض" عورت کیلئے غرض نہیں ہوتی۔"

"تو عورت کی خواہش بھی شوہر کیلئے قابلِ پذیرائی ہونی چاہئے۔"

"عورت کی خواہش مرد کی خواہش سے مغلوب ہے۔"

"میں اس کلیئے سے مستثنیٰ ہو جانا چاہتی ہوں۔"

"پچھتاؤ گی"

"پچھتا لوں گی"

"میں تمہارا شوہر ہوں"

(۳)

چھ مہینے اور گذر گئے۔ آج سلیم کی شادی ہے۔ امرتسر بارات جارہی ہے۔ لاہور کے معزز مشاہیر و ادیب ساتھ ہیں۔ تمام شہر میں شادی کی دھوم دھام ہے۔ صبح کے شائع ہونے والے اخباروں میں اس شادی کا اعلان نئے نئے عنوانوں سے کیا جارہا ہے۔

دو روز بعد بارات رخصت ہو کر لاہور پہونچی۔ "نشاط منزل" کا گوشہ گوشہ تازہ ہار اور پھولوں سے سجایا گیا۔ رات ہوئی چاندنی پھیلی۔ سلیم خلوت میں گیا۔ سب سے پہلا فقرہ جو سلیم کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا:-

"پیغمبر مرد ہوتا ہے اور عورت خداوندہ"

سلیم اپنے حاصلِ سفر پر مسرور تھا۔ اُس کا دل محبت اور پرستش کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ اور اُسکی آغوش بہارِ مقصد سے گلستاں تھی۔

(۴)

پورے ایک سال بعد وہی گرمیوں کا مہینہ آیا۔ سلیم نے اپنی شریکِ حیات سے کہا۔ "میں منصوری جارہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلوگی۔ سامانِ سفر تیار کرلو۔"

"مجھے چلنے میں عذر ہے۔"

"کیوں؟"

"بھائی کی علالت کی خبر امرتسر سے آئی ہے۔ کیا آپ کو نہیں معلوم؟"

"تو اُنھیں راستے میں پوچھتے چلیں گے۔"

"ڈھائی سال سے جانبین میں خاموشی ہے۔ معلوم نہیں آپ کس حال میں ہیں۔ میں عورت کا عملی تجربہ کر چکا ہوں۔ وہ اپنی خواہش کی غلام اور اپنے جذبات کی پجارن ہے۔ لیکن الحمد للہ کہ ابھی تک میں نے اُسکی خواہش کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ کیا اسے آپ عورت کی شکست تسلیم کرتی ہیں؟"

سلیم

چار روز بعد اُس کے خط کا جواب آیا۔

"شکر ہے کہ میں آپ کو یاد رہی۔ میں نے بھی مرد کا عملی تجربہ کر لیا ہے۔ مرد بھی اپنی خواہش کا بندہ ہے اور اپنی اغراض کا غلام۔ مگر آپ یہ سن کر مسرور ہوں گے کہ سوا سال تک بیوی بن چکنے کے بعد بھی میں نے غرض مندی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ اور اُسکی آرزو کو مردانہ وار ٹھکرا دیا۔ کیا اسے آپ مرد کی شکست نہ مانیں گے۔؟"

"خالدہ"

"بڑی ضدّی عورت ہے" سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا مرد کی خواہش بیوی بننے کے بعد بھی ٹھکرائی جاسکتی ہے؟" وہ کسی خیال سے پریشان ہو گیا۔ اُسے اپنی بیوی خالدہ کا خیال آگیا —— بالکل یہی واقعہ —— بالکل یہی معاملہ —— کیا ہر جگہ مرد عورت سے اسی طرح مغلوب ہے؟ —— ایسا کیوں ہے؟ وہ ہاتھ پر سر جھکا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ایک خط پھر لکھا:۔

خالدہ! تم میری بیوی کی ہم نام ہو۔ اس لئے مجھے تم سے معنوی دلبستگی ہے۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر مرد اور عورت کی اغراض میں وزن کیونکر قائم رکھا

"میں بھی آپ ہی کی بیوی ہوں۔"

سلیم غصے میں بھرا ہوا باہر چلا گیا۔ اور ملازم کو حکم دیا کہ اسبابِ سفر تیار کر کے ٹھیک ۸ بجے اسٹیشن پہونچ جائے۔ تعلیم یافتہ خاندان۔ ترقی یافتہ گھرانا، ذرا سی دیر میں یہ قصہ سارے گھر میں پھیل گیا۔ چھ ماہ کی بیاہی لڑکی کی یہ ضد کسی کی سمجھ میں نہ آئی سب نے سمجھایا۔ مگر وہ ایک نہ مانی۔ اور اس نے بھی اپنے ملازم اور ملازمہ کو حکم دے دیا کہ اسبابِ سفر ۸ بجے تک لاہور اسٹیشن پر پہونچ جائے۔

پلیٹ فارم پر ایک طرف سلیم ٹہل رہا تھا۔ دوسری طرف برقعہ میں اسکی شریکِ حیات مع اپنے ملازموں کے موجود تھی۔ ٹرین آنے کو تھی۔ انجن کی روشنی دور تک لوہے کی لائین کو آگ سی پگھلی ہوئی زنجیروں کی صورت میں نمایاں کر رہی تھی۔ ٹرین آئی دونوں سیکنڈ کلاس کے دو ڈبوں میں جا بیٹھے۔ بیوی امرتسر اتر گئی اور شوہر دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔۔ ٹرین آگے روانہ ہو گئی۔

۵

نو مہینے ہو گئے۔ سلیم نے باوجود منت اپنی شریکِ حیات کو بلانے کی اجازت نہ دی۔ تعلقہ دار صاحب نے کئی مرتبہ سلیم کو امرتسر بلایا۔ آدمی بھیجے۔ تار بھیجے۔ مگر سلیم نے ایک نہ سنی۔ سلیم کا غصہ اب کم ہو چلا تھا۔ محبت اس کے دل میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ ایسی حالت میں اُسے خ۔ ب کی یاد آئی۔ جس سے کبھی خط و کتابت تھی۔ اس کا رنگِ طبیعت بدل گیا۔ رجحانات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا۔ اور اس نے مدیر رسالہ کے توسط سے اُس کو خط لکھا۔

سلیم پر خوشی اور غم کے بین بین ایک حالت طاری ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے خط گر پڑا۔ اُس نے بجھی ہوئی آواز میں ذرا زور دے کر کہا۔ "خالدہ! خالدہ! کیا تمہیں خالدہ ہو! خوش نصیب ـــــ بدبخت ـــــ ہاں میں قصوروار ہوں ـــــ مجھے معاف کر دو۔"

اُس نے ملازم کو آواز دی۔ تار لکھا۔ اور حکم دیا کہ ابھی دے آؤ۔ شام کی ٹرین سے وہ خود امرتسر روانہ ہو گیا۔ دروازہ پر پہونچ کر غل اوڑھ لیا۔ اور دربان کو اپنا کارڈ دیا کہ "اندر لے جاؤ اور تعلقہ دار صاحب کی چھوٹی لڑکی کو دو۔"

"سلیم!" خالدہ چونک پڑی "کون سلیم۔ جس سے خط و کتابت ہی؟ یا جس سے میری شادی ہوئی تھی؟ یہ کون سے سلیم ہیں؟ وہ ہوتے تو کارڈ کیوں بھیجتے۔ تار کہاں سے آیا تھا؟ اُف، کمدو، ٹر، لکھ دوں کہ میں نہیں مل سکتی۔ شادی کے بعد مجھ سے یہ ناممکن ہے۔"

سلیم کا کارڈ واپس آگیا۔ اُس نے پڑھا۔ وہ مسکرایا۔ اور آواز دے کر سیدھا زنانخانے میں پہونچ گیا۔ خالدہ کی آنکھیں چار ہو کر جھک گئیں۔ اُس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ یہ کہتی ہوئی خیر مقدم کے لئے آگے بڑھی "دونوں آپ ہی ہیں۔" سلیم نے مسکرا کر کہا "جی ہاں اور دونوں آپ ہی ہیں" ـــــ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ جس سے ایک مسئلے پر بحث ہوئی تھی وہی میری شریک حیات بھی ہے۔"

خالدہ نے بہت محجوب مسکراہٹ سے کہا۔ "مجھے معاف کر دیجئے۔ یہ عورت کی خودداری کا امتحان تھا۔ جو آپ کے کہنے کے مطابق میں نے آپ کو دیا۔ اب میں آپ کی کنیز ہوں ـــــ سامانِ سفر تیار ہے آیئے منصوری چلیں ـــــ"

جاسکتا ہے۔ میں اس ناگواری کو معاشرت کے قوانین میں ترمیم کرکے دنیا سے ہمیشہ کے لئے مٹا دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری مدد کرسکتی ہو۔" (سلیم)

تین روز کے بعد جواب آگیا۔

"سلیم صاحب! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آپ بھی میرے شوہر کے ہمنام ہیں اس لئے مجھے بھی آپ سے یک گونہ تعلق ہے۔ مرد اور عورت کی اغراض میں وزن قائم رکھنے کیلئے رواداری کی ضرورت ہے۔ مثلاً میرے شوہر نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ منصوری چلو۔ میں نے عرض کیا۔ بھائی بیمار ہے۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ اُسے اس حالت میں چھوڑ کر منصوری جاؤں۔ وہ اکڑ گئے۔ میں بگڑ گئی۔ آخر اُن کے حقوق مجھ پر ہیں۔ تو کیا اُن پر میرا کوئی حق نہیں۔ وہ منصوری چلے گئے۔ میں امرتسر چلی آئی۔ اگر انھوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تو میں نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ اگر مرد عورت کو اپنی طرح انسان سمجھے تو ناممکن کبھی کوئی ناگواری پیدا نہ ہو۔ ہرج کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ امرتسر چلے آتے۔ ایک ہفتہ کے بعد میں اُن کے ساتھ منصوری چلی جاتی۔ لیکن مرد کے دل میں عورت کی طرف سے رعایت و مروّت نہیں ہے۔ وہ عورت کو پر تراشیدہ چڑیا کی طرح پنجرے میں بند رکھنا چاہتا ہے۔ اور پنجرہ اپنے ساتھ۔ بھلا فطرت شناس تعلیم یافتہ عورت اسطرح جانور بن کر رہنا پسند کرسکتی ہے؟۔ اگر مرد اس رسمی پنجرے کی بجائے عورت کو اپنے دل میں قید کرے تو یقیناً یہ قید اُس پر گراں نہیں گذر سکتی اور مرد آزادی کے ساتھ اُسے اپنی تمناؤں کا مرکز بنا سکتا ہے۔"

(خالدہ)

مرد وہ فطرت سے بعض اوقات شاکی رہتا تھا۔ تو ہمیں عامر کو کوئی الزام نہ دینا چاہیے۔ اس لئے کہ وہ غریب بھی تو تھا۔

ان لمحات میں وہ عالیشان محل کے مقابلے میں اپنے بوسیدہ اور شکستہ جھونپڑے کو فطرت کے فلسفہ عروج و زوال کی ایک زندہ یادگار سمجھتا تھا۔ بعض اوقات اس کو محسوس ہوتا کہ چاند کی نورانی کرنیں بھی جھونپڑے پر محل کو ترجیح دیتی تھیں۔ فطرت کی امارت پرستی یہ فرخ امیروں کے لئے قابلِ توجہ ہو یا نہ ہو غریب عامر کے احساسات کو مجروح ضرور کر دیتا تھا۔ وہ دیکھتا تھا اور نہایت حسرت کے ساتھ دیکھتا تھا کہ آندھی اور برسات اس کے شکستہ جھونپڑے کو تہ و بالا کر دیتی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں اُس عالیشان محل کی رونق میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ جب نظام کائنات میں برہمی پیدا ہوتی اور موسلا دھار بارش غریبوں پر ستم ڈھاتی تو عالیشان محل کی ارضی حوریں اپنے سریلے نغموں سے موسم کی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہتیں۔ عامر یہ سب کچھ دیکھتا اور ایک آہ سرد بھر کر رہ جاتا۔ رات کو جب دنیا ایک وسیع مقبرہ نظر آتی تو چاند خاموشی کے ساتھ فاتحہ خوانی کرتا ہوا چلا جاتا لیکن عامر کی نگاہیں دیکھتی تھیں کہ اُس کے غریب اور شکستہ جھونپڑے پر چاند بہت کم توجہ دیتا ہے۔ گویا چاند کی فاتحہ خوانی بھی محلات کے عیشِ فانی ہی کے لئے مخصوص تھی۔

عامر کی تمام زندگی عسرت میں گذری۔ نواب فرخ نے بارہا چاہا کہ اپنے محل کا رقبہ وسیع کرنے کیلئے اس کے جھونپڑے کی زمین بھی خرید لے لیکن عامر دولت پرست نہ تھا، غیرت پرست تھا، اس نے صاف انکار کر دیا۔ فرخ کے حواریوں نے فرخ کو یہ کہہ کر مطمئن کرنا چاہا کہ اُنکی ایک ٹھوکر جھونپڑے کا نام و نشان مٹا سکتی ہے۔ لیکن فرخ

اِزم....

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بپایمردیٔ ہمسایہ در بہشت
(سعدی)

عالیشان محل کے دامن میں ایک بوسیدہ جھونپڑا انسانی قوانین کے خود ساخ
اصولوں کی وحشت ناک مثال تھی۔ فطرت نے تو نواب فرخ اور غریب عامر کو دنیا میں
انسان ہی بنا کر بھیجا تھا لیکن ان میں سے ایک عالیشان محل کا مالک ہوا۔ اور دوسرے
کو صرف جھونپڑا ملا۔ اس نشیب و فراز کے عالم میں بھی فطرت کا برتاؤ دونوں کیساتھ یکساں
خوشی، اُمنگ، غم، جذبات کا اتار چڑھاؤ، اور فطرت کی دوسرے عطیات کو دولت کی تفری
کی مناسبت کا خیال نہ تھا۔ دونوں کو وقت پر بھوک محسوس ہوتی اور دونوں پیاس کے
وقت پانی کے متلاشی ہوتے۔

فطرت کی اس یکسانیت کا فرخ سے زیادہ عامر معترف تھا۔ اور اس کو ہونا ہی چاہئے
تھا۔ اس لئے کہ صرف یہی ایک ذریعہ تھا جو دنیادی اور مادی قوانین کی سخت گیری کی موجو
میں اُس کی ڈھارس بندھا سکتا تھا لیکن بعض اوقات عامر کا ذہن اس کے ارادوں سے
بغاوت کرنا چاہتا تھا۔ عامر کی زندگی کے یہ لمحات اس کے لئے بہت زیادہ اندوہناک تھے
وہ بار بار کوشش کرتا تھا کہ فطرت کو اپنا ہمدرد سمجھے اور اسے ہمدرد بنائے رکھے۔ لیکن

کہ ایک سبزہ زار میں جہاں ایک دولتمند سیر و تفریح کیلئے تعیش گاہ بناتا ہے. وہیں ایک غریب مزدور کی کٹیا بھی ہے. محل اور جھونپڑے کے مکینوں سے ہمیں غرض نہیں بلکہ ہم تو محل اور جھونپڑے کے ایک جگہ جمع ہونے پر متعجب ہیں ——— کیا ہماری دنیا محلوں اور جھونپڑوں کے انسانوں کی دنیا نہیں ہے؟۔

اگر ایسا نہ ہو تو ہزاروں قسم کے "اِزم" ایجاد کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئے میں پوچھتا ہوں کہ یہ سوشلزم یا کمیونزم یا آئڈیلزم اور ایسے ہی دوسرے اِزم کیا آجتک ہمارے کسی کام آسکتے ہیں؟ - فرخ بھی انہی "اِزم" کی اقسام میں سے کوئی اِزم ایجاد کر کے جھونپڑے پر قبضہ کر سکتا تھا لیکن کیا وہ واقعی ایسا کر سکتا تھا- یہ فرخ سے پوچھئے اس لئے کہ اس کا ذہن اس موضوع پر بہت زیادہ سوچ چکا ہو گا- اُن لوگوں سے بھی زیادہ جو ان "اِزموں" کا علم بلند کرنے کے باوجود ذہنی طور پر ان سے مطابقت نہیں کرتے. عالیشان محلوں میں رہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں جھونپڑے والوں کی ہمدردی و اعانت کا!۔

یہ تو میں مان سکتا ہوں کہ اگر امرا چاہیں تو اپنے ماتحت غریبوں پر عرصۂ حیات تنگ کر سکتے ہیں- اُن کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر سکتے ہیں اور اپنی دولت کے زور سے اُن کے خلاف قوانین نافذ کرا سکتے ہیں. لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان غریبوں کا وجود دنیا سے اس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟ بالفرض فرخ عامر کی زمین خریدنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو کیا عامر دوسری جگہ اپنا جھونپڑا تعمیر نہ کر لیتا؟ کسی "اِزم" کا حامی مجھے جواب دے کہ کیا اُس دوسری جگہ بھی جھونپڑا جھونپڑے کے نام سے موسوم نہ ہوتا؟

کو ایسی ٹھوکر میں اپنے انجام کی تصویر لرزاں نظر آئی۔ اور اُس نے احکام جاری کردئے کہ اگر عامر اپنا جھونپڑا اپنی رضامندی سے فروخت کرنے پر آمادہ ہو تو بڑی سے بڑی قیمت اسکی خدمت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن عامر اپنی ضد پر برابر قائم رہا۔

عامر غریب تھا۔ لیکن خود دار۔ اُس نے فرخ کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اور اسکی زندگی کے آخری لمحات تک اس کا شکستہ جھونپڑا محل کی تمکنت کا جواب بنا رہا۔ تاریک رات میں محل بجلی کے قمقموں سے بقعۂ نور نظر آتا۔ آرائش و زیبائش کا یہ عالم ہوتا کہ بجلی کی روشنی بھی محل کو آراستہ کرنے میں افتخار محسوس کرتی۔ لیکن عامر کا جھونپڑا ایک مٹی کے دئیے ہی پر مطمئن نظر آتا۔ محل کو جگمگاتے دیکھکر عامر کے چھوٹے بچے حیرت زدہ ہوتے تھے تو عامر اُنھیں یہ کہہ کر خاموش کردیتا کہ فرخ نے آسمان سے تارے توڑ کر اپنا محل سجایا ہے۔

ایک بچے نے کہا۔ "ابا جان۔ آپ بھی آسمان سے تارے لے آئیے۔"

عامر کے ذہن میں فطرت کا غیر مساوی سلوک بجلی کی ایک چمک کی طرح کوند کر رہ گیا۔ اسے یکایک محسوس ہوا کہ وہ انسان ہی نہیں بلکہ غریب بھی ہے۔ اسی کشمکش میں اس نے برہم ہوتے ہوئے جواب دیا "خدا کو نذر کرنے کیلئے ہمارے پاس دولت کہاں ہے"؟

بچہ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ "کاش خدا دولت پرست نہ ہوتا"

ایک طرف شاندار محل اور دوسری طرف شکستہ جھونپڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسانی توتوں کا نتیجہ سہی لیکن اس بات کے بھی شاہد تھے کہ اس افراط و تفریط کے زمانے میں دونوں کا وجود اپنی جگہ اٹل ہے۔ عامر فطرت سے شاکی ہو یا انسانی امتیازات کی حکمتِ عملی اس کو پژمردہ کرے۔ ہمیں اس پر نکتہ چینی کا حق نہیں ہم تو صرف دور سے دیکھتے ہیں۔

ایک طرف دامن پھیلائے نظر آئیں، لیکن دوسری طرف اُس نے فرخ کو دیکھا کہ وہ ایک گوشے میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔ اُس کا مسکرانا تمسخر کا پہلو لیے ہوئے تھا۔ عامر زندگی کی آسائشوں کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ فرخ نے کہا "دیکھو تم پر میرا یہ احسان ہے۔ تم میرے غلام ہو۔"

عامر نے اپنی ہاتھ سمیٹ لئے اُسکی آنکھیں کھُل گئیں۔ اُس نے سوچا کہ یہ احسان اور یہ غلامی میرے احساس وضمیر کیلئے ناقابلِ برداشت ہے۔ میں اس سے باز آیا۔ وہ اپنے جھوٹے محل کے خیال کو اپنے ذہن سے دور کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اور بہت دیر بعد وہ اپنے پرانے جھونپڑے پر خیال کو قائم کر سکا۔

فرخ کے ایلچی جواب کے منتظر تھے۔ عامر نے حمیت وغیرت کے شعلوں سے لبریز آنکھوں سے دیکھا۔ اور بغیر کسی پس وپیش کے کہدیا "مجھے فرخ کی دولت نہیں چاہئیے میں امیر بننا نہیں چاہتا۔ غربت ہی میرے لئے آسودگی ہے اور میرا جھونپڑا ہی میری جنت ہے۔ ہاں اگر فرخ میرے جھونپڑے ہی کو لینے پر مُصر ہے تو میں اپنے حقوق سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔"

عامر نے یہ کہا اور اپنا مختصر اثاثہ اپنے کاندھوں اور بغل میں لے کر بچوں کا ہاتھ پکڑے ایک طرف چل دیا۔

فرخ کو اسکی اطلاع سے کچھ مسرّت نہیں ہوئی۔ عامر کا خالی جھونپڑا اب اُسے اور بھی زیادہ خطرناک نظر آنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ گویا چند قوی ہیکل فرشتے اسکی حفاظت کر رہے ہیں۔ اور اس کا محل آہ عامر کے ناقابلِ برداشت شعلوں سے زمین کی پستیوں

غریبوں کو اُن کے حال میں رہنے دیجئے۔ غریب تو اپنی جمعیت اور اپنی اکثریت کے بل بوتے پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُن کو آپ کی کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔
ایک دن اسی غور و فکر میں فرخ کو اپنی بے بسی اور مجبوری کا خیال آیا۔ یہ وقت ایسا تھا کہ اگر عامر کو فرخ کی اس حالت کی اطلاع ہو جاتی تو وہ بہت مسرور ہوتا۔ اس لئے کہ اگر عامر فطرت کا شاکی تھا تو فرخ بھی فطرت سے شکایت کر رہا تھا۔ سوچتے سوچتے یکایک فرخ کا چہرہ طمانیت سے چمک اٹھا۔ اس نے اپنے حاشیہ نشینوں کو بلایا اور اپنا خیال اُن کے سامنے پیش کیا۔

فرخ کا خیال یہ تھا کہ عامر کو امیر بنا دیا جائے اور اُس کے لئے اتنی دولت مہیا کر دی جائے کہ وہ اپنے شکستہ جھونپڑے کو ایک چھوٹے سے خوبصورت محل میں تبدیل کر لے۔ ایسی صورت میں اس کے پُرشوکت محل کے دامن سے شکستگی کا دھبہ مٹ جائے گا۔ اس کے رفیقوں نے فرخ سے اتفاق کیا اور اس اسکیم پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا گیا لیکن کیا فرخ اپنے اس ارادے میں بھی کامیاب ہو سکا؟ آیئے میں آپ کو بتاؤں۔

یہ صورت اپنی ہئیت میں سوشلزم سے ملتی جلتی ہے۔ ہمارے سوشلسٹ بھی اسی خیال کے حامی ہیں کہ مزدوروں کو اتنی مراعات دے دی جائیں کہ ان کی حالت میں خوشگوار انقلاب ہو جائے۔ لیکن کیا یہ خوشگوار انقلاب خود مزدوروں کے لئے خوش آیند ہے؟ یہ فرخ کے سوچنے کی بات نہ تھی۔ بلکہ عامر نے اس پر غور کرنا شروع کیا

عامر نے جھونپڑے کی بجائے ایک بہت ہی خوبصورت محل کا تصور کیا۔ اس کی نگاہیں چمک اُٹھیں۔ وہ اپنی حالت میں انقلاب محسوس کرنے لگا۔ اسی زندگی کی آسائش

منزل کا تعاقب

(۱)

انار کلی لاہور۔

شریر راشدہ۔

تم مجھ سے شادی کے بعد کے حالات پوچھتی ہو؟ یہ تو بتاؤ تمہیں اپنے بال بچوں سے بھی فرصت ملی یا نہیں؟ منظر، اختر، نسیم —— مجھے تو تمہارے بچوں کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ اب اپنے "میاں" کو برتھ کنٹرول کا سبق دو۔ کہو تو میں دو ایک کتابیں بھیج دوں۔ اچھا آؤ اب کچھ دلچسپ باتیں کریں۔

شادی کے واقعات —— آہ، وہ ایک عالم رنگیں —— جو اب تک دل پر اور دماغ پر چھایا ہوا ہے —— محبت —— ترنم —— جذبات —— محویت —— وارفتگی اور سرمستی —— بے تکلفی اور سرخوشی —— کاش یہ زمانہ انہیں سامانوں کے ساتھ مستقل رہتا —— میں ایک نئی دلہن ہوں —— شار راشدہ —— دلہن! (اچھا ٹھہرو ذرا پان کھالوں)

میں تحلیل ہوتا جارہا ہے۔

وہ ڈر گیا ——— وہ سہم گیا ——— اُس کا بدن لرزنے لگا ——— اُسے اپنے محل کے چاروں طرف اِنتقام نفرت کی آگ بھڑکتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اُس نے فوراً اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ عامر کو ڈھونڈیں اور جسطرح ہو اُسے واپس لے آئیں۔

مگر یہ کوشش کامیاب ثابت نہ ہو سکی ——— عامر کسی شرط پر بھی واپس نہ آیا۔ عامر نے کچھ فاصلے پر ایک کھیت کے کنارے دوسرا جھونپڑا بنا لیا۔ لیکن تھا وہ جھونپڑا ہی محل نہ تھا۔ فرق یہ تھا کہ اب اُس کے جھونپڑے کے دامن پر چونے اور اینٹوں کا ایک انبارِ عظیم نہ تھا۔ اور اپنی جگہ پر صرف اس کا جھونپڑا ہی ہر چیز سے بلند نظر آتا تھا۔

نئی دُلہن ——— ”عذرا“

(۴)

شملہ

حسین راشدہ

کیوں، لفظِ حسین سے تمہارے شوہر تو بدگمان نہ ہوں گے؟

میں لاہور میں ڈوبی تھی اور شملے میں اُبھری ہوں۔ بی۔ اے۔ کے امتحان کے بعد انھوں نے سیر و سیاحت کی ٹھا دی ہے۔ میں بھی ساتھ ہولی ——— کوئی گناہ تو نہیں کیا؟ ——— ہنی مون!

شملہ تو تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ راشدہ۔ اگر تم یہاں ہوتیں تو میں تمہیں اپنی آنکھوں سے یہاں کے مناظر دکھاتی۔ میرے لئے پہاڑ کی خنک راتیں بھی تسکین آفریں نہیں ہیں۔ یہ برف پوش بلندیاں بھی میری اُس اندرونی آگ کا علاج نہیں جو ایک شعلۂ خاموش کی طرح میرے دل میں بھڑک رہی ہے۔ خدا جانے میں کیا چاہتی ہوں۔ زندانِ مراسم سے آزادی تو مل گئی مگر ابھی بہت سی اُلجھنیں باقی ہیں۔ جو سلجھتے سلجھتے ہی سلجھیں گی۔

میرا مطالعہ برابر جاری ہے۔ میں اُن کو پڑھ رہی ہوں۔ اور اب تو میں اُن سے واقف بھی ہوتی جا رہی ہوں۔ شاید دوسری دُلہنوں کو اس پُرخار وادی سے نہ گذرنا پڑتا ہو۔ شاید اُن کے شوہروں کا کردار اُن سے متوازن ہوتا ہو ——— افسوس اُن کا ”کرداری تفاوت“ میرے لئے ایک مُعمّہ بن گیا ہے۔ میں جتنا اس گتھی کو سلجھاتی ہوں، میری دشواریوں میں اُتنا ہی اضافہ ہو جاتا ہے ——— میں اُن سے جتنا

اچھی راشدہ۔ میرے کھوئے ہوئے ذہن اور دماغ کو سمجھاؤ کہ کیا یہ کیفیت جاودانی ہی۔ کیا ایک برس بعد بھی ہمارے خیالات اور احساسات اسی طرح جوان رہیں گے۔ اور پھر ساری عمر ——— ؟ کیا بڑھاپے میں بھی دن ہی سے رات کا انتظار رہا کریگا۔

میں جانتی ہوں کہ تم بوڑھی نہیں ہو۔ یہ تو صرف میرے خیالات کی ایک رَو ہی ——— ہنو نہیں۔ شادی انسانیت کی تکمیل ہے۔ کنوارپت تک انسان نامکمل رہتا ہے اور اس کے رجحانات اسی کی ذات تک محدود ہوتے ہیں۔ لیکن شادی کے بعد انسان میں بہت سی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو جاتا ہے ——— وہ ان ذمہ داریوں کو سلجھاتا اور الجھاتا رہتا ہے۔ یہی کشمکش انسان کو مکمل انسان بنادیتی ہے اور پھر ——— ؟ پھر یہی گہوارہ موت تک جانے کیلئے اُسے تیار کرتی ہے۔ اُف کتنا بھیانک خیال ہے! دیکھو، پھر وہی فکرِ مآل!

دو، نوخیز انسان شادی کی رنگین اور نازک زنجیریں مسکراتے ہوئے پہن لیتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کا بہترین زمانہ اور عیش و نشاط کا منتہائے کمال یہی وقت ہی دو اجنبی ہستیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ناواقف ہوتی ہیں۔ اس لئے ازدواجی زندگی کے آغاز میں شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے کردار سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ آگاہی دونوں کو قریب تر کردیتی ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔

"وہ" بھی میرے لئے ابھی اجنبی ہیں۔ میں انھیں بالکل نہیں جانتی۔ لیکن رفتہ رفتہ پہچان رہی ہوں۔ ——— لو وہ آگئے۔ اب مجھے ———

اور کتنے شہروں کی خاک چھاننا باقی ہے۔ لاہور سے شملہ، شملہ سے دہلی۔ سوچا کرتی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ آخر ہماری منزل کہاں ہے۔؟ ——— لیکن مجھے اس سے کیا مطلب۔ میرا فرض تو یہ ہے کہ میں اُن کے ساتھ رہوں۔

یہاں بھی اکثر میں اُنھیں پریشان دیکھتی ہوں۔ اُنھیں سب سے زیادہ اپنے مستقبل کی فکر ہے۔ یہاں وہ مشہور آدمیوں سے مل چکے ہیں۔ مگر کوئی اُن کے خیالات کو مطمئن نہ کر سکا۔ خیالات باتوں سے یکسو نہیں ہوا کرتے عمل سے ہوتے ہیں۔ اور وہ تعلیمی زندگی ہی میں عملی زندگی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اُس چیز کے متعلق وہ سوچ رہے ہیں اور غور کر رہے ہیں۔ جس کا ابھی وجود بھی نہیں۔ . . . .

کل حضرت نظام الدین اولیا۔ اور قطب صاحب کی زیارت کی۔ قطب مینار دیکھا ——— جب ہم دونوں مینار پر ایک دوسرے سے کبھی ہمدوش اور کبھی ہمکنار چڑھ رہے تھے تو وہ کہنے لگے ——— تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟

میں نے کہا۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہر انسان اپنی زندگی کے درجے اسی طرح خاموش اور آہستہ طے کرتا رہتا ہے۔ اور اُسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہر قدم جو بڑھ رہا ہے اُسے ارتقا کی طرف لے جا رہا ہے۔ وہ اس پر بہت ہنسے اور . . . . . . میں نے کہا۔ آپ ہر وقت اسی عالم میں کیوں نہیں رہتے۔

کہنے لگے۔ "زندگی کا راستہ اس مینار کی طرح تاریک اور تھکا دینے والا ہے۔ کبھی کبھی اور کہیں کہیں روشنی کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔ تو میں اس عالمِ نشاط میں آجاتا ہوں ورنہ دل گھبرایا کرتا ہے۔ اور دماغ پریشان رہتا ہے۔"

قریب ہونا چاہتی ہوں اتنا ہی اُن کو دُور دیکھتی ہوں۔

بائیس برس کی عمر، خوبصورت چہرہ۔ جوان و رعنا۔ سینما کے شوقین ——— سر پر انگریزی بال۔ کچھ آراستہ کچھ منتشر۔ مونچھیں نصف تراشیدہ۔ چھریرہ بدن۔ مستانہ چال اور اسقدر وارفتہ خیال۔ اتنا اُلجھا ہوا کردار! باتیں کرو تو وہ فوراً تمہارے ہم خیال ہو جائیں گے۔ جو کچھ کہو اُس پر فوراً صاد کر دیں گے۔ یہاں تک کہ اگر خود اُنکی اسیری کے محضر پر اُن سے دستخط لینا چاہو تو لے سکتی ہو۔ لیکن ذرا سوچنے کا موقع دیا اور وہ ہاتھ سے گئے۔ جو کام تم اُن سے ابھی لے سکتی ہو، آدھ گھنٹے کے بعد اس کے متعلق اُنکا انکار آہنی ہوگا۔

اِس عہدِ سرخوشی و مستی میں بھی اُنھیں کھویا ہوا سا پاتی ہوں میں اُنھیں ہر تدبیر سے یکسو کرنا چاہتی ہوں۔ میں اُن کے دل کی چمک کو جذب کر لینا چاہتی ہوں۔ لیکن نہیں کر سکتی۔ کبھی وہ مجھ سے بہت زیادہ مانوس نظر آتے ہیں۔ (کل میں اُنکے ساتھ سینما بھی گئی تھی)، اور کبھی متنفر سے نظر آتے ہیں۔ (آج میں تنہا بیٹھی ہوں) اور اُن سے کوسوں دُور رہنے کو جی چاہتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اُنکی کوئی حالت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی ورنہ راشدہ۔ میں تو دیوانی ہو جاؤں۔ اب میں کبتک انھیں کی باتیں لکھے جاؤں۔ زندہ ہوں اور بدستور زندگی کی تلاش میں۔ مردہ دل "عذرا"

دہلی۔ شاہجہاں منزل (۳۲)

"آسودہ خیالِ راشدہ"

اچھی تو ہو۔ میں ابھی مطمئن کہاں۔ ابھی تو شملہ اور دہلی ہی کی سیر ہوئی ہے۔ نہ معلوم

ہونہار گریجویٹ اگر مرید ہو جائے تو کیا بُرا ہے۔ اُن پر خوب اثر ڈالا۔ ان سے کہا "تمہارا مستقبل بہت شاندار ہے۔ تمہاری بھوؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے، وہ تمہارے مستقبل کی درخشانی کی دلیل ہے۔" وہ ہوٹل آئے۔ تو مجھ سے اُن پیر صاحب کی بہت تعریف کی اور کہنے لگے۔ میرا ارادہ ہے کہ اُن کا مرید ہو جاؤں۔

میں نے کہا سنئے صاحب پیری مریدی اب ایک رسمی چیز رہ گئی ہے۔ پہلے مرید ہوتے تھے۔ تزکیۂ نفس اور خدا رسی کے لئے۔ اب مرید ہوتے ہیں روپیہ کے لئے۔ ملازمت کیلئے۔ عورت کیلئے۔ تو آپ کو ان میں سے کس چیز کی ضرورت ہے؟ روپیہ کی کمی نہیں۔ شاید ایک عورت بھی آپ کو مل چکی ہے۔ اور روپیہ کی موجودگی میں ملازمت کا سوال ہی نہیں رہتا۔ ابھی وہ عمر بھی نہیں کہ آپ دنیا چھوڑ کر کسی گوشے میں صرف "الا اللہ" کی ضربیں لگایا کریں۔ اس لئے میری رائے میں تو آپ کا ارادہ قابلِ التوا ہے۔ ابھی تو "گناہ کی راتیں" پڑھنے کے دن ہیں!

اُنکی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ وہ مسکرانے لگے۔ اور میری طرف محبت سے دیکھنے لگے تو میں نے بھی مسکرا کر انہیں جھکا کر کہدیا کہ ابھی تو آپ "فنا فی العورت" بھی نہیں ہوئے۔ فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کی منزلوں کیلئے کسی کا ہاتھ پکڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں راشدہ میں نے سچ کہا نا؟

آج یہاں سے روانہ ہو جائیں تو اچھا ہے۔ "دنیا تمام حلقۂ دامِ فریب ہے"۔

شاد و ناشاد

"عذرا"

میں نے کہا - زندگی کے راستوں کو روشن بنالینا کیا بڑی بات ہے" اتنے میں ہم سب سے اوپر پہونچ گئے - تمام دہلی ہمارے سامنے تھی - ہم پھر مینار سے نیچے اُترے اور جب وہ مقام جہاں اُنھیں چھیڑ کی سوجھی تھی خاموش گذر گیا تو میں نے کہا کہ "دیکھئے جب انسان زندگی کی پستیوں سے گذرتا ہے تو اُس کے خیالات میں وہ سرمستی نہیں رہتی جو عروج کے وقت ہوتی ہے - وہ سمجھ گئے - اور پھر ....، شام تک ہم ہوٹل واپس آئے -

رات افسردہ اور تھکی ہوئی تھی - کھانا کھا کر سوئے تو سویرا تھا -

میں اپنے کردار اور ذہنی اضطراب کا اثر اُن پر برابر ڈال رہی ہوں - آج وہ بازار سے کئی کتابیں خرید کر لائے ہیں - گناہ کی راتیں ——— کمزوری ——— سرگذشت عروس عیش و نشاط - لاکر میرے پلنگ پر ڈال دیں - اور پھر کہیں چلے گئے - مجھے ان کتابوں کے دیکھنے کا یہ پہلا موقع ہے - میں نے دو تین کتابیں جستہ جستہ پڑھ ڈالیں - ہر کتاب عورت سے متعلق ہے - اور عورت ہی آجکل کے انسان کا سب سے زیادہ دلچسپ موضوع ہے - عریاں لٹریچر - رندانہ مضامین - ننگی زبان - برہنہ جذبات - گویا فطرتِ نسائیت کی گہرائیوں کو بے نقاب کر کے سوسائٹی کے سامنے رکھ دیا گیا ہے - لیکن ان کتابوں کے یہاں لانے سے اُن کا کیا مقصد تھا -؟ میرا ذہن اُلجھ گیا - میری طبیعت پریشان ہو گئی - مجھے اپنی منزل دُور نظر آنے لگی -

اور سُنو، دہلی تو بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے - یہاں درویشوں، پیروں اور مشائخ کی کمی نہیں - ایک صاحب اُنھیں بھی مل گئے - سوچا ہو گا کہ ایک دولتمند گھرانے کا

چل کہ اب خلوت میں لطفِ زندگی لُٹتی سحر
دلیں لُرا اُٹھی ترے گیسو کی موجیں دیکھ کر

یہی حضرت دہلی میں پیری مریدی کا ڈھونگ رچانا چاہتے تھے!

پیاری راشدہ۔ کیا کوئی تدبیر ایسی بھی ہے کہ میں اُن کے کردار کے اس رُخ کو مستقل بنا سکوں۔ میں اُنکی طبیعت میں ہر وقت ایسی ہی شعریت دیکھنا چاہتی ہوں۔

پھر ہم دونوں کشتی میں بیٹھ کر "منوڑا" گئے۔ سمندر کی پُرجوش موجیں پہاڑ سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ رہی تھیں اور پہاڑ بدستور خاموش کھڑا تھا۔ آج اس ملک کی سینکڑوں عورتیں اسی طرح مردوں کی سنگین فطرت کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ مگر مرد اپنی جگہ پر اٹل ہیں۔ اُنھیں اِن موجوں سے سبق لینا چاہیئے۔ بڑے بڑے پہاڑ پانی ہو کر بہہ چکے ہیں۔ مرد بھی ایک دن بلبلے کی طرح بیٹھ جائیں گے۔

سفر سے اُن کا مقصد جو کچھ ہو، مگر میری غرض صرف یہی ہے کہ میں اُنھیں اچھی طرح سمجھ لوں۔ اُن کے مذاقِ طبیعت سے آگاہ ہو جاؤں —— اور پھر جب گھر پہونچوں تو اُنھیں شیشے میں اتار کر رکھ سکوں۔

سفر سے زمانے کی ہوا کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ دنیا کا کیا رنگ ہے۔ دنیا کدھر جا رہی ہے۔ دنیا کا مذاق کیا ہے۔ یہ سب باتیں صرف سفر ہی سے تو معلوم ہوتی ہیں راشدہ، کاش تم بھی میرے ساتھ ہوتیں۔ مگر تم تو کنوئیں کی مینڈک ہو۔ تمہیں دنیا سے کیا کام! اچھا خوش رہو۔

آوارہ سر
"عذرا"

(۴)

کراچی۔

راشدہ۔ مجھے مبارک باد دو۔ آج میں مسرور ہوں۔ محض اس لئے کہ وہ بھی مسرور ہیں۔

آج شام کو ہم "ہوا بندر" گئے تھے۔ کراچی میں "ہوا بندر" سمندر کے ساحل پر ایک تفریح گاہ ہے۔ ہر شام کو بالعموم اور اتوار کو خصوصاً وہاں لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے عورتوں کیلئے ایک حصّہ معین ہے۔ لیکن عہدِ جدید کی عورت کی زندگی کا ایک رُخ مردانہ بھی تو ہے۔ چنانچہ ہر طرف "عورت مرد" اور "مرد عورت" نظر آتے تھے۔ ——— رنگین ساریاں اٹھلائی ہوئی چالیں، بکی ہوئی نظریں سمندر۔ کا ساحل ہر طرف آزادی ہی آزادی موجیں مارتی ہوئی نظر آتی تھی۔

وہ اور میں ہجوم سے الگ سمندر کے کنارے ٹہلنے لگے۔ انھوں نے ایک نظم کہی (تمہیں معلوم ہے وہ شاعر بھی ہیں!) صرف تمہارے لئے لکھتی ہوں۔ "منظر کے ابا" تک نہ پہونچا دینا۔

بحر کا ساحل، سہانی شام، دل آویز رنگ
پیاری عذرا! تیری دستِ ناز میں ہے سازِ چنگ

سرخ آنچل ہے ترا حسنِ بہارِ زندگی
تیرا چہرہ ہے شفق زارِ دیارِ زندگی

چل رہی ہیں ہر طرف تازہ ہوائیں عطر بیز
اور میرے دوش پر زلفیں یہ تیری شام خیز

ہے فضائے بحر نیرنگی سے لہرائی ہوئی
دیکھ عذرا، دیکھ کیا موجیں ہیں بھرائی ہوئی

موج آتی ہے یہاں ساحل پر اتراتی ہوئی
تیرے آنے کی خوشی کے گیت سی گاتی ہوئی

دیکھو وہ خورشید بھی پانی میں غوطہ زن ہوا
یک بیک آفاقِ عالم پر اندھیرا چھا گیا

اب سنو۔ یہ ہماری پانچویں منزل ہے۔ لیکن ابھی منزل کہاں۔ منزل کی تلاش میں تو میں بہت دن سے بھٹک رہی ہوں۔ منزل مل جاتی تو آرام سے بیٹھتی۔

یہ تو تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ وہ آجکل بمبئی میں ہیں۔ اس ہنگامہ زارِ حسن و تجارت میں ہر نہ بکنے والی چیز بھی بکتی ہے۔ حسن بھی بکتا ہے اور عشق بھی۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو مجھے لکھ دینا میں یہاں سے بھیج دونگی۔

وہ یہاں بھی مطمئن نہیں ہیں۔ راشدہ۔ بعض وقت تو ایسا جی چاہتا ہے کہ ہوٹل کے نیچے گذرنے والی کسی موٹر میں اوپر سے کود پڑوں۔ اُسکی بریک توڑ دوں پیٹرول کھول دوں۔ پھر اس دنیا کو کچلتی ہوئی اور زندگی کی کشمکشوں کو مجروح کرتی ہوئی دور بہت دور۔ دور سے بھی دور نکل جاؤں —— جہاں کوئی نہ ہو —— نہ کسی کے آنے کی اُمید ہو۔ اور نہ کسی کا انتظار رہے۔ کاش ایسا ہو سکتا!

یہ تو میں بتا چکی ہوں کہ وہ بہت جلد باتوں میں آجاتے ہیں۔ ایک واقعہ سنو اور سُن کر صرف مسکرا دو۔ غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ یہ فرض میں انجام دے رہی ہوں۔

وہ ایک ہوٹل میں تنہا جا رہے تھے۔ یہ تم جانتی ہی ہو۔ کہ موجودہ تہذیب و تمدن نے شریف ڈاکو پیدا کر دئے ہیں۔ جو الفاظ کا سنہری جال بچھا کر مسافروں اور سادہ لوح انسانوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ اسی قماش کا ایک شریف بدمعاش اُن تک بھی پہونچ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُن کو اپنا لیا۔ دو تین دن تک تو وہ اُن سے پوشیدہ طور پر ملتا رہا۔ آخر کل اس کو یہ حضرت موٹر میں بٹھا کر ہوٹل لے آئے ایک اجنبی شخص کو اُن کے ساتھ دیکھکر مجھے شبہ ہوا۔ وہ بالمقابل کمرے میں بیٹھے

بمبئی، تاج محل ہوٹل (۵)

—— میری راشدہ۔

یقیناً تم یہ معلوم کرنا چاہو گی کہ ہم بمبئی کیونکر پہونچے۔ کراچی سے بمبئی کو مقررہ اوقات پر جہاز روانہ ہوتے ہیں۔ ایک دن وہ بہت خوش خوش آئے۔ یہ لمحات میری زندگی میں بہت کم آتے ہیں۔ کہنے لگے۔ کہو کہاں چلو گی۔ میرے منہ سے بمبئی نکل گیا۔ انھوں نے کاندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ لو میں تو بمبئی کا انتظام بھی کر آیا۔ جہاز میں چلیں گے۔

اب میں ایسے مقام پر ہوں جس کے گرد و پیش رومانیت ہی رومانیت ہے گویا فطرت مجھے اپنی گود میں لئے بیٹھی ہے۔ سامنے ایک بیکنار سمندر موجیں لے رہا ہے۔ دور بہت دور جا کر آسمان اور سمندر ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک دنیا ہے جہاں زندگی کے صرف دو عنصر کام کر رہے ہیں۔ پانی اور ہوا۔ انسانی زندگی اس عالم سے اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسمیں دو عنصر زیادہ ہیں۔ خاک اور آگ۔ مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ عناصر میں جسقدر کمی ہو زندگی اتنی ہی سُبک اور لطیف ہو جاتی ہے۔ اس سمندر ہی کو دیکھو۔ باوجود پانی کی کثرت اور موجوں کے شور کے ایک قسم کا سکون چھایا ہوا ہے۔ خاموشی مستولی ہے۔ سکوت کار فرما ہے۔ موجوں کے شور سے جو نغمہ پیدا ہوتا ہے وہی اس عالم خاموش کی آواز ہے۔ یہ خدا جانے کیا کہتا ہے۔ چوپاٹی پر سیر کرنے والے مرد اور عورتیں کان رکھنے کے باوجود اسکی آواز پر کبھی توجہ نہیں کرتے۔

مختصر یہ کہ وہ بدمعاش ہاتھ ملتا ہوا چلا گیا۔ دوسرے دن یہ اخبار خرید کر لائے جسمیں لکھا تھا کہ ایک شخص جو فریب دے کر لوگوں سے لیمیٹڈ کمپنی کے نام پر روپے وصول کیا کرتا تھا۔ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ شخص وہی تھا جو اِن کو بھی ٹھگنے آیا تھا۔

اس نوعیت کے حادثات اس زمانے میں نئے نہیں ہیں۔ روزانہ اور ہر وقت دھوکے باز اپنی چال چلنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن جو انسان اپنے اصولوں کا پابند ہو اس قسم کے حادثات کا شکار نہیں ہو سکتا۔

خدا کا شکر ہے کہ اب ان کی سمجھ میں یہ بات آتی جا رہی ہے۔

غریب الوطن

"عذرا"

(۶)

کلکتہ :-

پیاری راشدہ۔

تمہیں میرے گذشتہ خطوط سے میری الجھنوں کا حال معلوم ہوا ہو گا۔ اب ہماری منزلیں جلدی جلدی ختم ہو رہی ہیں۔ ہنگامہ زارِ بمبئی سے رخصت ہو کر ہم کلکتہ آ گئے ہیں کل ہگلی کی سیر کو گئے تھے۔ وقت نہایت سہانا اور منظر نہایت دلکش تھا۔ ہم ہگلی کی موجوں میں بہے جا رہے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ یونہی بہے چلے جائیں۔ اور کبھی کنارے پر نہ پہونچیں۔ اسی خیال سے چپو میں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اور یہ شعر گانے لگی ؎

تلاطم کی وہ یورش ہے کہ اب جو کچھ ہے دریا ہے　　مری کشتی بھی اک موجِ رواں معلوم ہوتی ہے

اور میں دیوار سے لگ کر گفتگو سننے لگی۔ شریف رہزن اُن کو سبز باغ دکھا رہا تھا۔ اور ایسی ایسی اُمیدیں دلا رہا تھا کہ اگر اُن کی جگہ میں بھی ہوتی تو اُسکی باتوں میں آجاتی۔

رہزن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی لمیٹڈ کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ اور بے روزگار نوجوانوں کو ملازمت دلایا کرتا ہے۔ اور برسرِ روزگار ہونے کے بعد اپنی کمیشن لے لیتا ہے۔ میرے شوہر اچھے گھرانے کے کھاتے پیتے انسان ہیں۔ لیکن اُنکو یہ تمنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر دنیا میں نام پیدا کریں۔ ملازمت کی تو اُنھیں ضرورت ہی نہ تھی۔ اور اس بد معاش نے اُن کی صورت سے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔ وہ ان سے اس لئے ملا تھا کہ ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کی جائے۔ اس کے حصے فروخت کئے جائیں۔ اور اس مقصد کیلئے ابتدا میں کچھ روپے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے متعدد ساتھیوں سے بھی اُنکی ملاقات کرا چکا تھا۔ اُن کا منی آرڈر کل ہی آیا تھا کوئی ایک ہزار روپے ہوں گے۔ والدین نے بمبئی سے کچھ ضروری سامان لانے کو لکھا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے یہ بات بھی معلوم کر لی تھی۔ وہ اس کے شریف بشرے سے متاثر معلوم ہوتے تھے۔ اور اُس کے ساتھیوں کے وقار نے بھی ایک حد تک اُنکو مرعوب کر لیا تھا۔ فی الحال پانچسو روپے دینے پر رضامند ہو گئے تھے۔

اب مجھے فکر ہوئی۔ اور میں سوچنے لگی۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔ معاً میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے اُن کے بٹوے میں سے جو ہینڈ بیگ میں رکھا تھا روپے نکال لئے۔ اور بٹوا خالی چھوڑ دیا۔ اور ان پر یہ بات ظاہر نہ ہونے دی۔ وہ بہت برہم ہوئے۔ بالآخر خاموش ہو گئے۔

یہاں بھی ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ وہ کئی فلم کمپنیوں میں گئے۔ اس لئے کہ یہ دنیا اُن کے لئے نئی نہ تھی۔ مضامین لکھنے کی وجہ سے اُنھیں اس دنیا کی مخلوق اچھی طرح جانتی تھی۔ ایک فلم کمپنی نے کہیں کہدیا کہ آپ تو بڑے اچھے اور کامیاب ایکٹر بن سکتے ہیں دو سو روپیہ ماہوار تو ہم دینے کو تیار ہیں۔ آج ہی سے کام شروع کر دیجئے۔

گھر آکر اُنھوں نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے کہا خوبصورت اور دولتمند دیکھکر کہدیا ہوگا۔ آجکل کی بعض فلم کمپنیاں تو ایکٹریسوں کی ایجنٹ بن گئی ہیں۔ کوئی آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ملا، ذرا تعریف کی چکنی چپڑی باتیں بنائیں۔ اور جادو کی لکڑی پھیر دی۔ سامنے سے دو ایک ایکٹریسوں کو مسکراتا ہوا گذار دیا۔ بس کام بن گیا۔ لوٹ لاٹ کر کچھ عرصے کے بعد کہدیا کہ آپ ایکٹری کے اہل نہیں۔ چلئے چھٹّی ہوئی۔ فلمی دُنیا کا دوسرا نام "نمائشی دنیا" ہے۔ یہاں ہر چیز نمائش کیلئے ہوتی ہے۔ آپ کہیں اس چکر میں بھی نہ آجائیں۔

کہنے لگے تم سچ کہتی ہو۔ یہ کمپنیاں عیاشی کے مہذب اڈّے ہیں، میں نے اچھا کیا کہ ان سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ پھنس جاتا تو بہت بُرا ہوتا۔

میں نے کہا تم نے اُن سے یہ نہ کہدیا کہ میں ایک عورت کا شوہر بھی ہوں اگر اُنھیں یہ معلوم ہو جاتا تو وہ اس درخواست کی جرأت بھی نہ کرتے۔

کچھ دیر کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے اُنھیں پھر چھیڑا کہ اگر آپ مجھے بھی ایکٹریس بننے کی اجازت دیدیں تو آپ ایکٹر بن سکتے ہیں۔ وہ توبہ۔ توبہ۔ استغفراللہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اور میں بڑی دیر تک اس گفتگو کے تصوّر سے ہنستی رہی۔

قریب منزل
تمہاری نخدرا"

میرے خیال میں اس وقت ایک اتھاہ سمندر تھا اور میں اُن کے ساتھ اسمیں کھو جانا چاہتی تھی۔ موجِ خیال مجھے بہت دُور لے گئی تھی کہ یکایک اُنھوں نے میرے تصوّر کی دُنیا برہم کر دی۔ کہنے لگے اب لوٹنا چاہئے۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے۔ مجھے پھر دریا دریا اور کشتی کشتی معلوم ہونے لگی۔ میں نے افسردہ ہو کر چپّو چھوڑ دئے۔ اور خاموش بیٹھ گئی۔

آج مجھے اُنکی ایک اور خصوصیت کا علم ہوا۔ وہ ہر حالت سے بہت جلد اُکتا جاتے ہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی عشرتناک کیوں نہ ہو۔ اُن کے دماغ میں بیک وقت سینکڑوں پروگرام ناچنے لگتے ہیں۔ اور وہ اِن سب کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب نہیں کر سکتے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ میں نے اُنکے خیالات کو متوازن رکھنے کی ایک تدبیر سوچی ہے اور وہ یہ کہ انھیں کبھی خاموش اور اُن کے ذہن کو کبھی بیکار نہ رہنے دیا جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تیر نشانے پر لگ چکا ہے۔ وہ جس حالت میں ہوتے ہیں۔ میں اُن کو باتوں میں لگائے رکھتی ہوں۔ لیکن بڑی دقت تو یہ ہے کہ میں اُن کے ساتھ سوسائٹی میں نہیں جا سکتی۔

اگر ہر بیوی کو اوائلِ ازدواج ہی سے شوہر کے ساتھ رہنے کا کافی موقع مل جایا کرے تو اتنی دشواریاں نہ ہوں۔ میاں اور بیوی آجکل صرف اپنے خلوت کدے ہی میں ایک دوسرے کو میاں بیوی سمجھتے ہیں۔ اور سوسائٹی میں تو وہ ایک دوسرے سے اتنے دور رہتے ہیں کہ مشکل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مرد اور عورت ازدواج کی زنجیروں سے بھی وابستہ ہیں یا نہیں ؟۔

پیدا ہوں تو انسان کو اپنی طنابیں فطرت کے سپرد کر دینی چاہئیں۔ یہی ایک صحیح طریقِ عمل ہے اور منزل رسی کا مضبوط زینہ۔ بمبئی میں ہمیں معلوم ہوا کہ دنیا میں غرض مندی اور دغا بازی کا دور دورہ ہے۔ جو شہر جتنا زیادہ متمدّن ہے اتنا ہی خطرناک ہے۔ اور کلکتہ پہونچ کر تو میں انھیں اپنی گرفت میں لینے میں پوری طرح کامیاب ہوگئی اُنھوں نے میرے مشورے سے اپنی زندگی کا پروگرام بنایا ہے۔ پہلے وہ دنیا کی تلاش میں تھے اب دنیا اُنکی تلاش میں ہوگی۔ اور یہی ہمارے سفر کا حاصل ہے ؎

فطرتِ طلب معلوم ہاں مگر دیکھا ہے ٭ جس نے چھوڑ دی دنیا اسکے ساتھ دنیا تھی

اب میں اُن کے لئے وہ سب کچھ ہوں جو وہ مجھے بنانا چاہتے ہیں۔ اور میں نے بھی اُنکی طبیعت پر اتنا قابو حاصل کر لیا ہے کہ وہ مجھے اپنا سمجھنے لگے ہیں۔ راشدہ پیاری، ایک عورت اپنے شوہر پر اسی وقت قابو پا سکتی ہے جب کہ وہ اُس کے خیال، طبیعت ذہن، دماغ، اور دل پر قبضہ کرلے۔

اب میں اُن کے لئے "گناہوں کی راتوں" کا ایک کریکٹر بھی ہوں اور "سرگذشتِ عروس" والی ایک دُلہن بھی۔ ایکٹریس بھی ہوں، اور ایک عفیفہ بھی۔ وہ مجھے جیسا دیکھنا چاہتے ہیں ویسا ہی بن جاتی ہوں۔ یہ بات شوہر کا کریکٹر پڑھ لینے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔

راشدہ۔ مجھے منزل رسی پر مبارکباد دو۔ اور دعا کرو کہ میں ہمیشہ اسی منزل پر آسودہ رہوں۔

آسودۂ منزل

"عذرا"

(۷)

لاہور۔

ہیلو راشدہ۔ کیا کر رہی ہو۔؟۔

تم تو سوچ رہی ہو گی کہ میں ابھی سفر ہی میں ہوں۔ اور تمہیں دوسرے شہروں کے حالات لکھوں گی۔ مگر سرنامے پر لاہور پڑھ کر چونک تو نہیں پڑیں؟ ——

ہاں میں اور وہ لاہور آ گئے ہیں ——

راشدہ تم خیال کر رہی ہو گی کہ ہمارا سفر صرف روپیہ اور وقت صرف کرنے کیلئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تمہیں یہ سُن کر بڑی مسرت ہو گی کہ میں اپنی منزل پر پہونچ گئی ہوں۔ میں نے اُنھیں پا لیا ہے۔

شملہ۔ دہلی۔ کراچی۔ بمبئی۔ اور کلکتہ کے سفر میں مجھے متواتر اُن کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اور اُن کے کردار کی بہت سی خصوصیات مجھ پر واضح ہو گئیں۔ وہ دنیا کی سیر میں مصروف تھے اور میں اُنکی سیر کر رہی تھی۔ وہ دنیا کا پیچھا کر رہے تھے اور میں اُن کا۔ دیکھو آج وہ میرے ہیں اور حقیقی معنوں میں میرے ہیں۔

فرض کرو ہم شملہ نہ جاتے تو مجھے کس طرح معلوم ہوتا کہ وہ اپنی اسیری کے محضر پر دستخط کر سکتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچنے کا موقعہ دیا اور ہاتھ سے گئے۔ دہلی کے قطب مینار پر چڑھتے ہوئے میں نے اپنے چند بے سادھے سادھے الفاظ سے اُن پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہت زیادہ روشن محسوس کرنے لگے ہیں۔ قیام دہلی سے اُنھیں یہ تجربہ بھی ہو گیا کہ دل اور ضمیر سے بہتر مشیر کار اور کوئی نہیں۔ کراچی میں ہم فطرت سے قریب تھے۔ اور فطرت ہم سے۔ اگر ذہن میں زندگی کی پریشانیوں سے الجھاؤ

سوائے خوشامد کے کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اپنے اس فعل پر تنقید کی اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اگر مجھے یہ احساس ہو جاتا کہ آج دنیا میں، میں محض ایک ناقد کی حیثیت رکھتا ہوں تو اپنی زبان اور اپنے دماغ میں تالا ڈال دیتا۔ لیکن افسوس بہت دیر میں مجھے اپنی اس وجدانی کیفیت کا علم ہوا۔ میں نے بیگم کے جھلّانے پر تنقید کی۔ اس کا جھلّانا بھی میرے معیارِ نظر کے مطابق نہ تھا۔ کمرے کی ہر چیز پر رفتہ رفتہ نگاہ پڑی اور جی چاہا کہ ساری ترتیب درہم برہم کر دوں۔

یکا یک مجھے اپنی اس حالت کا احساس ہوا۔ مرضِ تنقید کا اشتداد دیکھ کر جی بھر آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہا۔

میں مسہری پر جا پڑا۔ اور تکیہ پر منہ رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد جب جذبات میں کسی قدر سکون ہوا تو سر اٹھایا۔ کمرے کی ایک تصویر پر نظر پڑی۔ ایک ایکٹرس بالکل میری ہی طرح تکیے پر سر رکھے رو رہی تھی۔

وہ ایکٹرس تھی اور میں ایکٹر ——— وہ اسٹیج پر ایکٹ کرتی ہے۔ میرا اسٹیج میری دنیا ہے، اس کو غمگین بننا پڑتا ہے۔ میں غمگین ہوتا ہوں۔ لیکن پھر بھی اس کا رونا میرے رونے سے بدرجہا بہتر تھا۔ تو کیا مجھے رونا بھی نہیں آتا؟۔

میں تنقید کی رَو میں برابر بہہ رہا تھا۔ اور اس سنجدھار سے رہائی ممکن نہ تھی۔ میں نے مسہری سے آئینہ اٹھا لیا۔ اور یہ دیکھنے کیلئے کہ بیگم کو کس طرح ناراض ہونا چاہئے تھا میں نے آئینے میں غصے کی شکل بنائی۔ تنقید تو بیگم پر کر رہا تھا نظر اپنی صورت پر جا پڑی

آئینے میں

جب انسان کا ذہن تنقیدی خیالات سے لبریز ہوتا ہے تو پروازِ تخیل کی حد میں قائم نہیں رہتیں ۔ ۔ ۔ دنیا کی ہر چیز اسے اپنے نظریوں کی روشنی میں ناقص نظر آتی ہے۔ اور طبیعت کسی طرح بھی اپنی موجودہ حالت میں رہنا گوارا نہیں کرتی۔ اسی دوران میں چند لمحات ایسے بھی آتے ہیں۔ جب انسان خود کو فطرت کا ایک نقص سمجھنے لگتا ہے اور پھر دوسروں کے افعال و حرکات پر تنقید! یہ تو قوتِ تنقید کا پہلا وار ہے۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میرا دماغ تنقید کے ابتدائی دَور سے گذر رہا تھا۔ چنانچہ جاتے ہی بیگم کے سیفٹی پن پر، اسکی ساری پر، ہونٹوں کی سُرخی پر، غرض کہ جو چیز سامنے آئی اسی پر میں نے تنقید کر ڈالی۔ بیگم آئینے میں بال سنوار رہی تھی۔ گو ایک مدت سے میں نے کسی کے اس مقولے کو اپنی ازدواجی زندگی کا جزو بنا لیا تھا کہ عورت ہمیشہ تعریف سے خوش ہوتی ہے اور اپنے ایک ناخن کی تنقید بھی اس کے لئے سوہانِ روح ہے۔ لیکن آج خلاف معمول وہ میری تنقید کا سب سے پہلا شکار ہو گئی۔

اُس نے جھلا کر آئینہ مسہری پر پھینک دیا۔ اور کچھ بڑبڑاتی ہوئی کمرہ سے باہر نکل گئی۔ اُسی وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن تیر کمان سے باہر نکل چکا تھا۔ اور اب

یہ شخص محسوس کرتا ہے کہ اس ہنگامہ زار ہستی میں وہ بالکل تنہا ہے۔ اس کے پیش نظر چند مقاصد ہیں۔ اُن مقاصد کی تکمیل کیلئے وہ دنیا کی مدد چاہتا ہے۔ دنیا اُسے پاگل سمجھتی ہے اور دھتکار دیتی ہے۔

میں نے اس انسان کو مختلف حالتوں میں دیکھا ہے اور اُسکی ناکامیوں پر خندہ زن بھی ہوا ہوں۔ یہ شخص میری مسکراہٹ کی آواز سنتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے کہ کوئی مافوق الفطرت ہستی اُسکی رہنمائی کر رہی ہے اسی ہستی کی تلاش میں وہ آسمان کی طرف نظر اُٹھاتا ہے۔ لیکن نہیں سمجھتا کہ اسکی رہنما ہستی اسی کے دل میں ہے اور وہ میں ہوں ——

اس انسان کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ انسان کا زیور انسانیت ہی وحشت اور درندگی نہیں۔ انسانی زندگی کا ایک دور وحشت اور درماندگی کا آئینہ دار بھی تھا۔ یہ اُس دور کا بیٹا ہے۔ باپ نہیں —— دنیا خدا کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ خدا دنیا کی انتہائی منزل ہے۔

یہ ایک عظیم المرتبت انسان ہے۔ اور عجیب فطرت کا حامل۔

مجھے اس انسان سے خوف معلوم ہونے لگا۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اس شخص کو وہیں چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ اسکی گرفت اتنی کمزور نہیں کہ اس سے پیچھا چھڑایا جا سکے۔

وہ میری طرف جھکتا ہوا معلوم ہوا۔ اُسکی تنی ہوئی بھویں میری بھووں سے مل گئیں ناک اسکی ناک سے لگ گئی۔ آنکھوں میں آنکھیں گڑ گئیں اور ہونٹوں میں ہونٹ جذب ہو گئے —— میں کہاں تھا؟ اس حقیقت کا علم مجھے اُس وقت ہوا جب اپنے ارد گرد میں نے

اور دماغ دوسری طرف کام کرنے لگا۔

میں آئینے میں تھا۔ یا آئینہ مجھ میں؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ بہرحال میری روح مادیت سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ میرا جسم آئینے میں تھا اور روح آئینے سے باہر۔ روح نے جسم کو دور سے دیکھا اور مسکرائی۔ اس کا مسکرانا طنزیہ تھا ________

جسم مقید تھا، روح آزاد تھی۔ روح جسم سے محاسبہ کر رہی تھی۔

میرے مقابل میں ایک انسان تھا۔ جسے میں اجنبیت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مختلف کیفیتیں طاری تھیں۔ کبھی وہ سیب کی طرح سرخ ہو جاتا تھا اور کبھی خزاں رسیدہ پتوں کی طرح زرد۔ بال پریشان تھے۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہونٹ ہلتے تھے۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ غور سے کان لگا کر سننے سے سانس کی تیز آواز آئینے سے باہر سنائی دیتی تھی۔ اس کے جذبات میں ہیجان تھا۔ کبھی شگفتگی کے آثار بھی اسکے چہرے پر نظر آ جاتے تھے۔ لیکن یہ کیفیت بہت دیر قائم نہ رہتی تھی۔ یہ شخص میرا آشنا سا ہے لیکن اس وقت اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔

اسی انسان کو میں نے مختلف کیفیتوں میں دیکھا ہے۔ کبھی مسرت کے جذبات اسمیں اس قدر فروزاں ہوتے ہیں کہ یہ انسانی زندگی کے تمام تاریک پہلوؤں کو بالکل بھول جاتا ہے۔ کبھی غم کی حالت اس پر اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ اسکی زندگی کے وجود پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ جہاں یہ شخص دنیا کی تعمیر کیلئے کوشاں ہے وہاں دنیا کو پیامِ تخریب بھی دیتا ہے اور پھر ان دو متضاد حالتوں میں مشترک جذبات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

غلطیوں کی ایک رات

بھائی شریف کو بہتیرا سمجھایا کہ بھوں گانوں نہ جاؤ۔ وہاں کی آب و ہوا اچھے خاصے انسانوں کو بیوقوف بنا دیتی ہے۔ مگر وہ ایک نہ مانے اور یہی کہتے رہے کہ بھوں گانوں کی حماقت آفرینی محض روایتی چیز ہے۔ جو لوگ عقلمند ہوتے ہیں وہ ہر جگہ عقلمند ہی رہتے ہیں۔ ان دلائل کے سامنے کسی دوسرے کی کیا پیش جا سکتی تھی اور اُنکی عقلمندی کو جھٹلانا گویا خود کو بیوقوف ثابت کرنا تھا۔ چنانچہ ہم خاموش ہو رہے اور شریف صاحب بالآخر ریلوے کے ٹھیکدار ہو کر بھوں گانوں سدھارے۔

بھوں گانوں پہونچنے کے بعد اُن سے کیا کیا حماقتیں سرزد ہوئیں یہ تو شریف صاحب ہی کو معلوم ہوگا۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی لکھتے رہے کہ اُنکی عقلمندی بہت سے لوگوں کو بیوقوف بنا رہی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بھوں گانوں کی آب و ہوا نے اُنمیں یہ جرأت بھی پیدا کر دی کہ اُنھوں نے بیک بینی و دو گوش ہمیں بھی بھونگانوں آنے کی دعوت دے دی۔ پھر کیا تھا۔ کوئی خط ایسا نہ آتا جسمیں یہ نہ لکھا ہو کہ اگر آپ کو ہمارے عقلمند ہونے میں شک ہو تو خود آ کر دیکھ جائیے۔

چند لوگوں کو دیکھا۔ اُن کے چہروں پر پریشانی کے آثار تھے۔ ڈاکٹر میرے سرہانے بیٹھا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میرے دماغ کو کوئی صدمہ پہونچا ہے۔

ایک طرف ایک مولوی صاحب کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہے تھے —— والد صاحب کے ہاتھ میں پنکھا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو والد نے پدرانہ شفقت سے پوچھا "کیوں سلیم کیا ہے؟" ....

مولوی صاحب کا حکم ہے کہ گھر میں ایک آئینہ بھی نہ رہنا چاہئے۔

دن جمعہ کو صبح یوتھ لیگ کا جلسہ تھا۔ جس کی صدارت ہم شکریہ کے ساتھ منظور کر چکے تھے۔ اور جس کے لئے ہم نے خطبۂ صدارت بلا مبالغہ ایک ہفتے کی لگاتار محنت کے بعد تیار کیا تھا۔ اور چونکہ وہ ہر حیثیت سے ہمارا خطبۂ صدارت تھا۔ اس لئے ہم نے جلسے میں تقسیم کرنے کیلئے پانچ ہزار کاپیاں چھپوا بھی لی تھیں۔ محنت کے بعد اس سخاوت نے خطبے کی قیمت دہ چند کر دی تھی۔ شریف صاحب کو ہماری صدارت کی اطلاع ہو چکی تھی لیکن پروگرام سے انھیں آگاہ نہیں کیا تھا۔ خیال تھا کہ اچانک پہونچیں گے۔ تمام کو ہم نے تانگہ منگوایا۔ اسباب رکھا اور روانہ ہو گئے۔

گاڑی میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ ہم سوچتے جا رہے تھے کہ بھونگاؤں پہونچنے کے بعد شریف صاحب سے کیا گفتگو ہو گی۔ وہ الٹا ہمیں بیوقوف بنائیں گے۔ کہیں گے کہ اگر وہ ریلوے کی پیش کش منظور نہ کرتے تو انھیں اتنے ہزار کا نقصان ہوتا۔ اس کے بعد وہ اپنی عقلمندی کی داستان الاپیں گے۔ ہمیں ندامت ہو گی۔ اور اپنی بیوقوفی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ کہ مفت میں بھونگاؤں کی آب و ہوا کو بدنام کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم صبح کی گاڑی سے روانہ ہو جائیں گے۔ شریف صاحب ہمیں روکیں گے۔ لیکن ہم اپنی صدارت کے حقوق کو بروئے کار لائیں گے۔ اور مدبرانہ انداز کو کام میں لاتے ہوئے وہاں سے چل دیں گے۔

ہم انھیں خیالات میں محو تھے کہ ہر قدم پر ہر دو منٹ کیلئے تانگہ رکنے لگا۔ ہم نے گھڑی دیکھی تو گاڑی کا ٹائم ہو چکا تھا۔ ہم تو اپنے خیالات میں بھونگاؤں بھی پہونچ چکے تھے اور تانگے والا کبھی گھوڑے کی لگام درست کرنے کے لئے تانگہ روکتا

جب بھائی شریف کا خط آتا تو پہلے ہم اُسے پھونک کر صاف کرتے۔ پھر لفافہ کھول کر خط کو کئی کئی مرتبہ جھاڑتے اور جب یقین ہو جاتا کہ اب خط پر بھونگانوں کی آب وہوا کا کچھ اثر نہیں رہا اُس وقت کھڑکی میں جھک کر اور باہر ہاتھ کر کے اُسے پڑھتے پھر پُرزے پُرزے کر کے کھڑکی سے نیچے ہی پھینک دیتے۔ ان تمام احتیاطوں کیلئے ہمیں ہمیشہ تخلیے کی تلاش ہوتی تھی۔ اور اس کوشش میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

بھائی شریف کا اصرار برابر جاری تھا۔ اور اِدھر ہمارا مسلسل انکار۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ اُن کا اصرار کام آیا نہ ہمارا انکار۔ اتفاق کی بات "انڈین یوتھ لیگ فرخ آباد" نے ہمیں اچانک اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اور اعلان بھی کر دیا اور اسطرح ہمیں عزم بالجزم کرنا پڑا کہ جب فرخ آباد جائیں گے تو بھائی شریف سے بھونگانوں میں ضرور ملیں گے۔

اس مرحلے پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بھونگانوں کا جغرافیہ بیان کر دیا جائے بھونگانوں، شکوہ آباد فرخ آباد لائن پر مین پوری کچہری سے دوسرا اسٹیشن ہے۔ کلکتہ اور دہلی سے آنے والے اور فرخ آباد جانے والے مسافروں کو شکوہ آباد پر گاڑی تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ یہ ٹکڑا ای۔ آئی۔ آر کی برانچ ہے۔ اور شکوہ آباد سے فرخ آباد کی کل مسافت ۶۶ میل سے زیادہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں بعض مقامات کی آب وہوا مصلح خون ہے۔ مثلاً شکار پور۔ جون پور وغیرہ۔ انھیں میں ایک مقام بھونگاؤں بھی ہے۔ جہاں تیار سے تیار اور مہذب سے مہذب دماغ کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

جس دن ہم روانہ ہونے والے تھے وہ جمعرات کی شام تھی۔ اور اُس کے دوسرے

صدارت سے ہمیں کیا تعلق۔

ہم اِدھر اُدھر مایوسانہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ کہ ایک یکہ والا آتا دکھائی دیا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور بغیر کچھ طے کئے اس کے ساتھ ہو لئے۔ بیچارے نے خود ہی اسباب اُٹھایا اور ہمیں یکے تک لے آیا۔ اتفاق کی بات کہ وہاں ایک ہی یکہ تھا۔

یکے پر اسباب رکھنے کے بعد یکے والا ہماری طرف دیکھنے لگا۔ گاڑھے کی فرغل میں اُسکی چمکدار چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلی اپنے شکار کو اپنے سامنے رکھ کر اُس سے پوچھ رہی ہے کہ اب تجھے کس طرح کھاؤں۔ یہ بھونگاؤں کا پہلا انسان تھا جو ہمیں ملا۔

ہم نے شریف صاحب کا نام لیا۔ اُن کا کام بنایا۔ یکہ والا یہ نام سُن کر اچھل پڑا گویا کہ شریف صاحب اُس کے رشتے دار ہیں۔ کہنے لگا۔ ہاں صاحب خوب جانتا ہوں اُن سے تو روزانہ کام رہتا ہے۔ اُن کا ملازم میرا دوست ہے۔ اور میرے ہی یکے پر بیٹھکر شہر سے سودا لاتا ہے۔

یکے والے کی شریف صاحب سے اس قدر قربت معلوم ہونے کے بعد ہمیں کوئی دوسرا سوال کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی اور اللہ کا نام لے کر ہم یکے میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دور چل کر یکے والا ہم سے مخاطب ہوا۔ ارشاد ہوا کہ نزدیک کے راستے سے چلوں یا دور کے؟

اسکے اس سوال پر ہمیں کچھ تعجب ہوا اور کچھ ہنسی بھی آئی۔ ہم نے کہا دور کیا نزدیک

کبھی چابک گر پڑتا اور کبھی روشنی گل ہو جاتی غالباً بھونگاؤں کی آب و ہوا نے تانگے والے پر اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

خدا خدا کر کے اسٹیشن پہونچے۔ بھاگ کر جلدی سے ٹکٹ لیا۔ ہانپتے ہوئے گاڑی میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ گاڑی روانہ ہو گئی۔ قلی پیسے مانگتا ہی رہ گیا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو تانگے والا بھی ہماری طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ جلدی میں اُسکے پیسے بھی رہ گئے تھے۔ ہماری سانس اس قدر پھولی ہوئی تھی کہ ہم کسی سے عذر بھی نہ کر سکے دوسرے اسٹیشن پر دیکھا تو قلی موجود۔ ہمیں تعجب ہوا کہ یہ یہاں کہاں سے آگیا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ دوسرے ڈبے میں سوار ہو گیا تھا۔ ہم نے طوعاً وکرہاً اُس کا قرض ادا کر دیا۔

شکوہ آباد سے گاڑی بدلنی پڑی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم مع اسباب دوسری گاڑی میں آسانی سے بیٹھ گئے۔ اور جب ۹ بجے رات کو بھونگاؤں کا اسٹیشن آیا تو ہم انسانوں کی کیطرح وہاں اُتر گئے۔

رات کا وقت، دسمبر کا مہینہ اور آسمان پر بادل۔ بھونگاؤں کے موسم پر ہنسی آئی۔ ہم نے اپنے لباس کا جائزہ لیا تو یہ دیکھکر ذہن کو اطمینان ہو گیا کہ موسم کا کوئی حربہ ہم پر کارگر نہیں ہو سکتا۔ قلی کو آواز دی۔ مگر قلی کیا وہاں ٹکٹ کلکٹر کا بھی پتہ نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ بھونگاؤں پر بہت کم مسافر اُترتے تھے۔ دن بھر کے بعد اُس اسٹیشن پر ہم ہی غالباً پہلے اور آخری مسافر تھے۔ اور یہی سبب تھا کہ کسی نے ہمارا استقبال نہیں کیا۔ مگر ہاں ہم تو یوتھ لیگ کے صدر تھے۔ بھونگاؤں کے اسٹیشن کی

ہوا تھا۔ اور ملازم ہماری مزاج پرسی کیلئے بھیجا گیا تھا۔

ملازم نے پوچھا:۔ آپ کون ہیں؟ اور کیا کام ہے؟

"کیا شریف صاحب گھر پہ ہی ہیں؟" ہم نے بھیگی بلی بنتے ہوئے استفسار کیا۔

"کون شریف صاحب؟" ملازم نے ہمیں گھور کر پوچھا۔

"ریلوے ٹھیکدار اور کون؟" ہم نے ذرا ہمت سے کام لیکر جواب دیا۔

"یہ مسٹر شرافت ٹی۔ ٹی آئی۔ ای۔ آئی۔ آر کا بنگلہ ہے۔ یہاں شریف ورلیف کوئی نہیں رہتا"

ملازم بے نیازانہ جواب دیتا ہوا بنگلے میں داخل ہوگیا۔ اور دروازے بند کر لیے۔

جی تو چاہا کہ دوڑ کر اس کو پکڑ لیں اور اس گستاخی کی سزا دیں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر رہ گئے۔ اور پیچھے لوٹے یکے والے نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔

"صاحب اتنی دیر ہو گئی۔ مجھے گھوڑا کھولنا ہے۔ جلدی سے اسباب اُتار دیئے اور پیسے دیجئے"

اس عالم میں یکے والے کے یہ الفاظ سُن کر ہمیں ہنسی آگئی۔

ہم نے سیدھے سادھے الفاظ میں اس کو سمجھایا کہ یہ مکان مسٹر شریف کا نہیں مسٹر شرافت کا ہے اور وہ غلطی سے ہمیں یہاں لے آیا ہے۔

ہمیں یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ یہ بات یکے والے کی سمجھ میں فوراً آگئی اور وہ اپنی غلطی پر متاسف نظر آنے لگا۔ اب کیا ہو؟ ہم سوچ میں پڑ گئے یکے والے نے ہماری اس الجھن کو بھی دور کر دیا اور کہا صاحب چلئے۔ میں آپ کو اسٹیشن لے چلوں گا۔

جہاں ہم نے اتنی غلطیاں کی تھیں وہاں یہ غلطی کرنا ہم پر بار نہ ہوا اور ہم تن بہ تقدیر

کے راستے سے چلو۔ یہ جواب دینے کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی دریافت کر لیا کہ نزدیک کے راستے اور دور کے راستے میں کیا راز ہے۔

یکے والے نے جواب دیا۔ اجی فرق تو کچھ نہیں۔ نزدیک کا راستہ نزدیک اور دور کا کا دور ہے۔ میں نے ویسے پوچھا تھا کہ شاید آپ ذرا گھومتے ہوئے چلیں۔

یکے والے کی اس پیش کش کو اس کی نفاست کے اثر پر محمول کرتے ہوئے ہم ہنس کر خاموش ہو گئے۔ جھٹکوں اور یکے کے جھونجھن سے ہماری ہڈیاں پسلیاں ایک ہوئی جا رہی تھیں کہ دو گھنٹے بعد یکے والے نے ایک بنگلے پر جا کر یکہ کھڑا کر دیا۔

ہم نے نیچے اتر کر دیکھا۔ بہت شاندار بنگلہ تھا۔ ہمیں شریف صاحب کی قسمت پر رشک ہوا کہ بھونگاؤں پہونچنے کے بعد ہمیں تو قلی اور تانگہ بھی نصیب نہ ہوا اور شریف صاحب کو دیکھئے کہ رات کے بارہ بجے تک بجلی کے قمقمے جل رہے ہیں۔ اتنے میں ہمیں قہقہوں کی آواز سنائی دی۔

یہ کیا؟ کیا شریف صاحب یہاں پہونچ کر مغربی معاشرت میں بھی رنگ گئے پیانو بجنے لگا اور گانے کی چند لطیف نسوانی آوازیں آنے لگیں۔

ہم اس طلسمی بنگلے کو غور سے دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک بوڑھا آدمی جو صورت سے باورچی معلوم ہوتا تھا آیا۔ یکے والے نے اس کو دیکھتے ہی ایک نعرہ بلند کیا اور کہنے لگا کہ ہاں ہاں یہی ہیں۔ ان سے پوچھئے آپ کو پتہ چل جائے گا۔

بوڑھا ملازم ہماری طرف بڑھا۔ اور ہم کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدھی رات کو ہمارا بنگلے میں داخل ہونا اہلِ خانہ کی نازک طبیعتوں پر بہت بار ثابت

ہم بھیگے اور ٹھٹھرے ہوئے بکنگ آفس کی طرف گئے۔ بکنگ کلرک خراٹے لے رہا تھا اُسے آہستہ سے جگایا تو کروٹ لیتے ہوئے بولا "کیا ہے۔ ٹکٹ ابھی نہیں ملے گا۔ کیوں دق کرتے ہو۔"

ہم نے کہا "صاحب ہمیں ٹکٹ لینا نہیں ہے۔ ایک بات پوچھنی ہے۔" وہ لیٹے ہی لیٹے بولا "بات وات کچھ نہیں۔ کیوں پریشان کرتے ہو۔ چلو یہاں سے۔"

ہم نے بہ منت کہا کہ جناب ذرا تکلیف فرما کر صرف ایک بات بتا دیجئے۔ آخر وہ اُٹھا اور کہنے لگا۔ آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔

ہم نے کہا ہم پردیسی ہیں۔ مسٹر شریف ٹھیکدار ریلوے کے یہاں جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہاں رہتے ہیں۔ کچھ پتہ آپ کو معلوم ہو تو بتا دیجئے۔

آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے ہمیں غور سے دیکھا۔ گو ہم کتنے ہی بھیگے ہوئے اور برسات کے مارے ہوئے تھے تاہم صورت سے شریف معلوم ہوتے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے کہا۔ ٹھیکدار صاحب بھونگاؤں اسٹیشن کے بالکل پاس رہتے ہیں۔ اسٹیشن یارڈ سے اُن کا بنگلہ ملا ہوا ہے۔"

"بھونگاؤں اسٹیشن کے پاس" ——— ہمارا دم ہی تو نکل گیا۔

کلرک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم باہر نکلے۔ یکّے والا اسطرح کھڑا تھا گویا ہمارے کسی نئے حکم کی تعمیل کا منتظر ہے۔

یکّے والے کی حالت پر ہمیں رحم آگیا آخر بھونگاؤں کا باشندہ تو تھا ہی۔ آج ساری رات وہ ہمارے ساتھ پھرا تھا۔ اُس کے گھوڑے سے زیادہ خود اسکی حالت قابلِ رحم تھی۔ اور

یکے میں بیٹھ گئے۔

بارش ہونے لگی تھی۔ اور ہمارا یکہ ہڈیاں پسلیاں ایک کرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا تھا۔ بھیگنے کے بعد اب اس کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ اور اسکی پرانی کلیں عجیب قسم کے گیت گانے لگی تھیں۔ ادھر بارش کی بھرمار۔ بوندوں کی بوچھار۔ ادھر یکہ کہتا "چرخ چرخ چرخ چوں"۔

تو ہم فوراً دوسرا مصرع لگا دیتے۔ "بھائی شریف میں آتا ہوں"۔

یکے میں کوئی جگہ ایسی جگہ نہ تھی جہاں پناہ مل سکتی۔ تمام کپڑے پانی میں شرابور ہو گئے یکے کی لالٹین بھی بجھ گئی۔ پہیے گڑھوں میں دھسنے لگے۔ اور ہم پریشان۔ بجلی چمکتی تو راستہ نظر آتا۔ سڑک کے کنارے درخت ہماری بے کسی و بے بسی پر تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے۔ اور ہم ان سے بچنے کے لئے آگے بڑھتے مگر درختوں کا لامتناہی سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا۔ اب رہی سردی تو اس کا ہمارے پاس کافی انتظام تھا۔ یکے والے نے بھی دیہاتی گیت گا گا کر اپنے گرم ہونے کا انتظام کر لیا تھا۔

خدا خدا کر کے یکے والے نے کہا صاحب اسٹیشن آگیا ہے۔ گھبرائیے نہیں۔ ہم نے خدا کا شکر کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لت پت اترے۔ کپڑے منوں بوجھل ہو رہے تھے۔ اسباب تمام بھیگ گیا تھا۔ اتر کر معلوم کیا کہ ہم کہاں ہیں۔ مسافروں سے جو ایک چھوٹے سے مسافر خانے میں اونگھ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ "موٹا" اسٹیشن ہے۔

"موٹا"؟ ارے یہ ہم کہاں آ گئے" میں نے یکے والے سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے جواب دیا کہ صاحب کنسٹر صاحب کے مکان سے تو یہی اسٹیشن قریب تھا۔

ایک رفیق بھونگاؤں کی روایات کو آزما کر یوتھ لیگ کی صدارت کرنے جا رہا ہے۔

رات بھر کی تکان تھی۔ ہم فوراً ہی ریل کے صوفے پر اس طرح گر پڑے جس طرح کوئی شخص تالاب میں اینٹ پھینک دے۔ ہمیں یقین تھا کہ لیگ والے خود آ کر جگا لیں گے۔

نو بجے دن کے کسی شخص نے ہم کو جگایا۔ ہم سمجھے کہ جلسے والے ہیں اور ہمارے لئے پھولوں کے ہار لائے ہیں۔ اس لئے اپنی شان دکھانے کے لئے تھوڑی دیر لیٹے رہے۔ لیکن جب کروٹ لیکر ذرا افتخار کے ساتھ اُٹھے تو قلی نظر آیا۔ ہم نے صدر کے لہجے میں پوچھا کیوں کیا ہے"؟

حضور اسٹیشن آ گیا۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔

پلیٹ فارم پر جلدی میں اُترے تو کسی چیز میں پاجامے کی موری اٹکی اور ایک پائینچہ نیچے سے اوپر تک پھٹ گیا۔ اوپر نظر اٹھی تو ایک بورڈ پر جلی حرفوں میں بخطِ انگریزی لکھا تھا۔

"شکوہ آباد"

یکے سے زیادہ ہماری اُس نے پوچھا "کیوں صاحب شریف صاحب کا مکان مل گیا؟ اسباب اُتار لیجئے"
اگر یکے والے کا بس چلتا تو وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر بھاگ جاتا اور کرایہ کا مطالبہ بھی نہ کرتا
لیکن ہماری غلطیوں کی تعداد اس کی ذات سے وابستہ تھی۔ وہ ہم سے کس طرح پیچھا چھڑا
سکتا تھا۔

ہم نے اُس کو تسلی دیتے ہوئے کہا "ہاں اُن کا مکان مل گیا۔ بھونگاؤں اسٹیشن لے چلو۔"
"بھونگاؤں اسٹیشن لے چلوں؟ نا صاحب نا۔ اب یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ اپنا اسباب اُتار
لیجئے۔ اور کسی یکے پر چلے جائیے گا۔" یکے والے نے بڑے خود دارانہ انداز سے جواب دیا۔
مگر پیسہ بُری بلا ہے۔ آخر لالچ میں آگیا۔ اور ہم واپس چل پڑے۔ مختصر یہ کہ بھونگاؤں
کے اسٹیشن پر جب ہم پہونچے ہیں تو رات ختم ہو چکی تھی۔ ساری رات سفر کرنے کے بعد
اب قدم اُٹھانے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن مسٹر شریف سے ملنے کا خیال برابر اکسا رہا
تھا۔ بھونگاؤں اسٹیشن پر پہونچنے کے بعد ہمیں پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ ہم یوتھ لیگ
کے صدر بھی ہیں جو اُسی دن ۹ بجے فرخ آباد میں ہونے والی تھی۔

یہ خیال آتے ہی مسٹر شریف اور انھیں کے ساتھ یکے والا سب ذہن سے فراموش
ہو گئے۔ اسٹیشن پر گاڑی آچکی تھی۔ ہم نے جلدی سے یکے والے کو کرایہ دیا۔ تمام
شکر ہے اس مرتبہ قلی مل گیا۔ اور ہم بخیریت گاڑی میں سوار ہو گئے۔

واقعی مسٹر شریف کا بنگلہ اسٹیشن سے بالکل قریب تھا۔ ریل سے بنگلہ کا وارنڈہ
دکھائی دیتا تھا۔ گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔ مسٹر شریف وارنڈے میں ٹہل رہے تھے اور
سگریٹ پیتے ہوئے ٹرین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کو اس وقت کیا علم کہ اُن کا

کی موجوں میں ہلکا سا شور تھا ــــــ سورج کی کرنیں "غسلِ صبح" میں مصروف تھیں۔ ارسلہ اپنی جھونپڑی سے نکلی ــــــ اور انگڑائی لیتی ہوئی اپنے بوڑھے باپ کی طرف دیکھنے لگی جو مچھلی پکڑنے کا جال سلجھا رہا تھا۔

"اب تو بہت سونے لگی ہے۔ دیکھ تو کتنا دن چڑھ گیا۔ رکمنی، بملا، نرملا، سب سمندر کے قریب پہونچ چکیں اور تو ابھی سو رہی ہے۔"

"میں اب کہاں سو رہی ہوں بابا ــــــ ابھی جاتی ہوں۔"

"ہاں ــــــ جاؤ ــــــ اگر آج بھی جال خالی آیا تو شام کو ہماری جھونپڑی بغیر چراغ کے تاریک پڑی رہے گی۔"

"ایسا نہ ہوگا ــــــ بابا ــــــ لائیے جال مجھے دیجئے ــــــ میں جاتی ہوں" ارسلہ فرسودہ اور بارہا آزمودہ جال لے کر چلی ــــــ اُسکی ہمسایہ لڑکیاں پہلے ہی سمندر کے کنارے پہونچ چکی تھیں ــــــ وہ کسی خیال میں محو چلی جا رہی تھی ــــــ چلی جا رہی تھی ــــــ اور اُسکے جال کا ایک حصہ ریت پر خطِ کہکشاں کھینچنے میں مصروف تھا۔

ــــــ وہ سمندر کے ایسے حصے پر پہونچ گئی جہاں کوئی نہ تھا۔ اُس نے جال زمین پر پھینک دیا۔ طلوع ہونے والے سورج کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اپنے کالے اور گھنے بال کمر سے نیچے تک کھول دئے۔ اور جسم سے لپٹی ہوئی سُرخ گرمیلی ساری کے دامن ہاتھوں میں لئے ہوئے غسل کرنے کے لئے ساحل سے نیچے اُتر گئی ــــــ

"اگر آج بھی مچھلی نہ آئی تو جھونپڑی میں چراغ نہ جلے گا۔"

بوڑھے باپ کے یہ الفاظ اُس کے کانوں میں گونجے ــــــ وہ اپنی دھن میں

چراغِ ساحل

ارسلہ! کیا آج صبح نہ ہو گی؟ ——————

سمندر کے ساحل پر ایک شکستہ اور آب خوردہ جھونپڑی ہے، جس کا پھونس دھوئیں اور گرد و غبار کا رنگ چڑھتے چڑھتے سیاہ ہو گیا تھا۔ ایک بھرائی ہوئی سی آواز نکلی۔ جس کے ختم ہوتے ہی جھونپڑی کے ایک گوشے میں کچھ بوسیدہ چیتھڑوں کو حرکت ہوئی۔ اور ارسلہ، گدڑی کے لعل کی طرح، خواب آلود، خمار آشنا آنکھیں ملتی ہوئی دونوں ہاتھوں کے سہارے اٹھی —— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب سمندر کے ساحل سے نہیں بلکہ جھونپڑی کے گوشے سے طلوع ہو رہا ہے۔ یا رنگ و بو کا ایک طوفان جسے سمندر کی موجوں نے مغرب و مشرق کے سواحل سے سمیٹ کر ایک جگہ محفوظ کر دیا تھا، انگڑائی لے رہا ہے۔

ارسلہ اٹھی۔ اس نے اپنی دراز اور سیاہ پلکوں کو، جو اس کے طلائی عارض کی بوسہ گیر تھیں اوپر اٹھایا۔ اسکی نیم باز انکھڑیوں میں خمار سے سرخ ڈورے گردش کر رہے تھے۔ اس نے ایک غلط انداز نگاہ سے جھونپڑے کے باہر دیکھا، ایک سرد آہ بھری اور "اٹھتی ہوں" کہتی ہوئی قیامت کی طرح کھڑی ہو گئی —— سمندر

مچھلیوں کا انتظار کر رہی تھی۔

ارسلہ ایک ایسے کام میں مصروف تھی۔ جو کوشش سے بالاتر تھا۔ یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ مچھلیوں کو جال میں لے آئے۔ تاہم وہ مایوس نہ تھی۔ اُسکی کنول جیسی آنکھوں میں شبنم کے سے موتی جھلک رہے تھے۔ مگر وہ اِن موتیوں کو ساحل کی بے حس ریت میں برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے آنسو پی رہی تھی ——— اور جال سمیٹ رہی تھی ——— اُس کے دلمیں یہ خیال برابر چٹکیاں لے رہا تھا کہ آج رات کو اُسکی جھونپڑی تاریک رہے گی۔ اُسے بھوک پیاس کی فکر نہ تھی۔ اُسے اپنے پھٹے ہوئے لباس کا خیال نہ تھا۔ مگر وہ اس خیال سے ٹھرا رہی تھی کہ آج اُسکی جھونپڑی بے نور رہے گی ——— وہ ساحل سے لوٹی ——— اُس کا ایک ایک قدم ایک ایک من کا تھا۔ وہ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ مگر اُس کا دل لئے ادھر جانے سے رُک رہا تھا ——— وہ جھونپڑے تک پہونچ گئی ——— اب دس بجے تھے ——— اسکا بوڑھا باپ آرام کی نیند سو رہا تھا ——— ارسلہ باہر ٹھہر گئی ——— جال جھونپڑی پر ڈالدیا۔ اور اس بیل کی سبز پتیوں کو عالمِ حیرت میں چھونے لگی جو اسکی جھونپڑی پر چھائی ہوئی تھی اور جسے وہ روز اپنے ہاتھوں سے پانی دیا کرتی تھی۔ گیارہ بج گئے ——— ارسلہ اب بھی مغموم اور خوف زدہ کھڑی ہوئی تھی ——— اُس کے باپ کی آنکھ کھلی ——— وہ اپنی غلیل لے کر جھونپڑے سے نکلا کہ اگر کوئی دریائی جانور ساحل پر مل جائے تو اُسے اپنی غذا کیلئے شکار کرے۔ ارسلہ اُداس کھڑی تھی ——— بوڑھے نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا ——— اور جال پر ایک مایوسانہ نظر ڈالنے کے بعد پوچھا۔ "کب آئی ارسلہ؟"

نہاتی رہی ــــ اُسکے بالوں کا جال سمندر کی سطح پر تیر رہا تھا ــــ اور وہ خود ایک سُنہری مچھلی معلوم ہو رہی تھی۔

جب وہ اچھی طرح نہا چکی۔ تو اُس نے اپنی ساری کھول دی، سڈول ہاتھ پانی سے باہر نکالے، ساری کو نچوڑا ــــ اور باندھتی ہوئی ساحل پر آگئی۔

اُس کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بے شمار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جال سے تڑپ کر نکل رہی ہیں اور ریت میں جذب ہو رہی ہیں۔

ارسلہ نے اپنا ٹوٹا ہوا جال اُٹھایا ــــ اور تھوڑی دُور آگے بڑھ کر ایک آبنائے میں مچھلیاں پکڑنے کیلئے ڈال دیا۔ اُس کے دماغ میں یہ آواز بدستور گونج رہی تھی کہ "اگر آج بھی مچھلی نہ آئی تو جھونپڑی میں چراغ نہ جلے گا۔"

دن کے نو بج گئے۔ مگر جال میں کوئی مچھلی نہ آئی۔ آتی کیونکر؟ جال کے حلقے کُہنگی کی وجہ سے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ پانی میں جاتے ہی مٹی کی طرح گُھل جاتے تھے۔

ارسلہ کی طبیعت اُداس تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر آج مچھلیاں نہ ملیں۔ تو اُس کا باپ بیحد خفا ہوگا۔ اور اُسکی جھونپڑی، ساحل کی ہیبت ناک فضا میں تاریک پڑی رہے گی۔

رُکمنی۔ بملا۔ نرداؔ، اپنے جال مچھلیوں سے بھرے ہوئے ادہر سے گذریں اور ارسلہ کو دیکھکر ہنسی کی نارش اُن کے ہونٹوں پر مسکرائی ــــ ارسلہ نے اپنی آنکھیں اُنکی طرف سے پھیر کر نگاہیں نیچی کرلیں۔ اور یاس و حسرت کے ساتھ دیکھنے لگی۔

سورج اُفق سے جتنا دُور ہوتا جارہا تھا۔ ساحل کی ہوا اتنی ہی پراگندہ اور پریشان ہوتی جاتی تھی ــــ مگر ارسلہ اپنی جھونپڑی میں شام کو چراغ جلانے کے لئے بدستور

"سمندر میں!" ارسلہ کی زبان سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ اور وہ نو واردنوجوانوں کی طرف دیکھنے لگی۔ "آہ —— بھوکا تھا —— غریب —— کمزور —— آہ میرا بوڑھا باپ۔"

نوجوان اسکی حالت پر افسوس کرتے ہوئے ساحل کی طرف چلے گئے۔ اور ارسلہ بے اختیار سمندر کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ جہاں اُس نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا تھا وہاں اب وہ اس کو غروب ہوتے دیکھ رہی تھی۔ موجوں نے اس کو آگے بڑھنے سے روکا —— اور وہ مجبور ہو کر کنارے پر کھڑی ہو گئی —— سورج غروب ہو رہا تھا —— ارسلہ کے تصور میں اپنی جھونپڑی تھی —— وہ دیکھ رہی تھی کہ سورج کی طلائی کرنیں عالمِ خیال میں اُس کے جھونپڑے کو روشن کر رہی ہیں —— سورج غروب ہو گیا —— ارسلہ کی جھونپڑی تاریک ہو گئی۔

"میری جھونپڑی بے چراغ کے نہیں رہ سکتی" —— ایک آواز وحشیانہ انداز میں فضا میں گونج گئی۔ اور زور سے ایک دھماکہ ہوا۔

شام کی تاریکی نے کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیا —— ارسلہ آہستہ آہستہ پانی میں جذب ہو رہی تھی —— اُس نے ساحل کی طرف دیکھا —— شکاری نوجوان اُسکے جھونپڑے کو خالی دیکھکر اپنی رات روشن کرنے کیلئے اُسے جلا چکے تھے —— اور جھونپڑے کے تابناک شعلوں کو دیکھ دیکھکر قہقہے لگا رہے تھے ——

ارسلہ نے اطمینان آفریں نگاہوں سے اس منظر کو بھی دیکھا —— اسی اطمینان اور اسی سکون میں ارسلہ نے خود کو موجوں کے سپرد کر دیا۔ فطرت کا چراغ بجھ چکا تھا۔ لیکن ارسلہ کا چراغ روشن تھا اُسکی جھونپڑی اُداس اور تاریک رات میں منور تھی۔

"ابھی آئی ہوں پاپا"

"کیا مچھلیاں آج بھی نہیں ملیں"

"نہیں ملیں"

"کیا سمندر ہماری غذا سے خالی ہو چکا ہے۔ کیا سمندر کی موجوں میں اب ہماری زندگی کیلئے کوئی سامان نہیں رہا؟ —— اے سمندر کے دیوتا ہم پر رحم کر" —— بوڑھا کچھ بڑبڑاتا ہوا اپنی غلیل لئے آگے بڑھتا چلا گیا —— ارسلہ جھونپڑی کے اندر اُداس بیٹھ گئی۔ "آہ۔ میرا بوڑھا باپ" اُسکی زبان سے نکلا —— وہ رونے لگی —— اور جھونپڑی میں زمین پر بیٹھ کر فطرت کی غریب آزار روش اور جبر و اختیار کے تعلق سوچنے لگی۔ شام کے چار بج گئے۔ ارسلہ کا باپ نہ آیا۔ ارسلہ سوئی اور جاگی روئی اور مسکرائی —— مگر ارسلہ کا باپ نہ آیا۔

وہ جھونپڑے سے نکلی اور تجسس آفریں نگاہوں سے اپنے بوڑھے باپ کو ڈھونڈھنے لگی۔ —— مگر وہ وہاں کہاں تھا؟ وہ سمندر کی طرف چلی —— چند نوجوان شکاری جو صبح کشتیوں پر بیٹھکر سمندری جانوروں کا شکار کرنے کیلئے گئے تھے۔ اب شام کو اپنے شکار بند بھرے ہوئے کامیاب واپس آرہے تھے۔ ارسلہ نے ایک ہنستے ہوئے اور ڈرتے ہوئے انداز سے پوچھا —— "کیا آپ کو میرا بوڑھا باپ کہیں راستے میں ملا ہے؟"

ایک نوجوان نے مسکرا کر کہا "تمہارا بوڑھا باپ! —— ہم اُسے نہیں جانتے لیکن ایک بوڑھا شخص ابھی سمندر میں گرا ہے۔ ہم نے اُسے بچانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ڈوب گیا۔"

جس چیز نے گیتی آرا کی طرف متوجہ کیا وہ فلم میں اس کے اظہارِ محبّت کا پارٹ تھا۔ جب کبھی وہ ہیرو سے اظہارِ محبّت کرنے پر مجبور ہوتی تو اُس کے چہرے پر عجیب کیفیت نمودار ہوتی تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ محبّت کا پارٹ ادا کرنے میں اس کے جسم سے روح نکالی جا رہی ہے

اسمیں گیتی آرا کا قصور نہ تھا۔ اسکرین پر ہی نہیں عملی زندگی میں بھی اسکو یہی مشکل پیش آتی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ اسکی فطرت میں محبّت کا جزو شامل ہی نہ تھا۔ عنصر محبّت کے فقدان نے اُس کے حالات کی روش کو بہت بڑی حد تک مرتب کیا تھا کیا ایسی عورت محبت کئے جانے کے قابل نہیں۔ جو کسی سے محبّت نہیں کر سکتی؟ میں نے اپنے دل سے سوال کیا۔

فلم دیکھنے کے بعد میں ایک عرصے تک گیتی آرا کے کردار کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا میں نے اُس کو مختلف فلموں میں دیکھا اور ہر فلم میرے قائم کردہ خیال کو تقویت پہونچاتا رہا یعنی اُسے واقعی محبّت کرنا نہ آتا تھا۔ میں عملی تجربے پر کمربستہ ہو گیا . . . . . .

گیتی آرا نے مجھ سے خط و کتابت میں بھی یہی ثبوت دیا میں اسکے خطوط بہت دلچسپی سے پڑھا کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ خطوط میں بھی محبت کے اظہار میں لفظ لفظ پر ٹھوکر کھاتی تھی۔ گیتی آرا کا وجود میرے لئے ایک معمّہ تھا۔ میں اُسے جتنا سمجھنے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی مختلف ہو جاتی تھی۔ اُسکے کردار کی یہی ایک ایسی خصوصیت تھی جسکی وجہ سے میں اُسکی متعلقات سے دلچسپی لینے لگا۔ میں نے اُس پر اخباروں اور رسالوں میں متعدد مضامین لکھے۔ مگر میرا ہر مضمون ایک دوسرے سے مختلف ہو گیا۔ یہ بھی گیتی آرا کے کردار کا ہی کرشمہ تھا۔ یا تو وہ فی الحقیقت مختلف کرداروں کا مجموعہ تھی اور یا ایک ایسا مجسمہ جسمیں ایک مصنف مختلف کرداروں کا مرقع دیکھ سکتا تھا۔ بالآخر گیتی آرا کی

گیتی آرا

میں یہ تو نہ کہوں گا کہ وہ دنیا کی حسین ترین دوشیزہ تھی۔ اس لئے کہ جو کچھ میں بیان کرنے والا ہوں اس کو اُسکے حُسن سے بہت کم تعلق ہے۔ وہ بدصورت بھی نہ تھی کیونکہ افسانہ نگار عموماً ہیروئین کا کردار بدصورت عورتوں کو نہیں دیا کرتے۔ مجھے اُسکی زندگی کے جس شعبے سے واسطہ پڑا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ آجکل کی تہذیب یافتہ ایک نوجوان دوشیزہ تھی ——— اور بس ——— میں یہ بحث اتنا کہہ کر ہی کیوں نہ ختم کر دوں کہ وہ ایکٹریس تھی۔ اب اُسکے بعد گیتی آرا کی بہت سی خصوصیات آپ کے ذہن میں خود آجائیں گی۔

سب سے پہلے میں نے اس کو ایک فلم میں دیکھا۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ وہ اس فضا میں نووارد ہے۔ اُسکی نگاہیں، اسکی چتون، حرکات وسکنات اُسکی زبان، قدم، غرضکہ سارا جسم اُسکی اجنبیت پر روشنی ڈال رہا تھا۔ ابھی وہ اس مرحلے تک نہ پہونچی تھی کہ اُسکے متعلق کہا جاسکے کہ وہ سارے جسم سے شاعری کرتی ہے۔ وہ ناتجربہ کار تھی۔

فلم میں کہیں وہ کشتی چلاتی دکھائی گئی تھی اور کہیں ڈاکوؤں کے نرغے میں۔ لیکن مجھے

وہ گا سکتی ہے۔ اور عین اسوقت جب کہ واقعی محبت سے لبریز آغوش اُسکی طرف مائل ہو وہ کھجور کے پیڑ کی طرح کنارہ کش ہو سکتی ہے۔"

اور میں نے سب سے الگ ہو کر گیتی آرا کے متضاد کردار سے یہ نتیجہ اخذ کیا - کہ لوگوں کے تمام اختلافات محض اس بنیاد پر قائم ہیں کہ وہ محبت کرنا نہیں جانتی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ گیتی آرا قابلِ الزام نہ تھی۔ اس لئے کہ غالباً اُسکا کام ہی ایسا تھا کہ وہ مختلف لوگوں میں مختلف حیثیتوں سے پیش ہو اور کسی کو خوش نہ کر سکے۔

میں نے گیتی آرا سے ٹیلیفون پر گفتگو کی۔ میں فون پر گیتی آرا سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ اظہارِ محبت میں ناکامی کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان محبت کا نام سنے تو اُسکے اعضا میں، اس کے ذہن اور دل میں ایک اُلجھن سی پیدا ہو۔ فون پر نہ تو میں اُسکے اعضا دیکھ سکتا تھا نہ چہرے کا متغیر رنگ مجھے نظر آسکتا تھا۔ البتہ اس کے الفاظ خیالات کے ترجمان تھے۔ وہ محبت کا نام سن کر عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ ذہنی جنگ سے پریشان ہو رہی ہے ——— گفتگو کے دوران میں اُسکی سانس پھول گئی اور اُسے پانی پینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شاید اس لئے کہ محبت کی تشنگی اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔

اب مجھے گیتی آرا سے بالمواجہ ملنے کی ضرورت سختی سے محسوس ہونے لگی۔ میں نے اس کو پارٹ کرتے دیکھا تھا۔ میں خط و کتابت میں بھی اُسکی خصوصیت محسوس کر چکا تھا۔ اس کے متعلق سوسائٹی کے متضاد خیالات بھی میری نگاہ میں تھے اور اب ٹیلیفون کی گفتگو سے بھی میرے خیال کو تقویت پہونچ چکی تھی۔ اب صرف ایک صورت اور باقی تھی اور وہ یہ کہ میں نظری مشاہدہ کروں۔ چنانچہ ایک شام کو غروبِ آفتاب کے بعد میں گیتی آرا کے گھر پر تھا۔ میں ایک

کشش مجھے ایک دن بمبئی کھینچ کرلے گئی۔

بمبئی پہونچنے کے بعد میں نے ایسی سوسائٹی میں شرکت کی جسکے افراد کو گیتی آرا سے کسی نہ کسی درجے میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میں مقامی طور پر اس کے حالات سے واقفیت حاصل کر دوں۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ افراد بھی گیتی آرا کے متعلق متحد الخیال نہیں ہیں۔ کسی نے کہا۔

"وہ بہترین ایکٹریس ہے لیکن کسی خاص ایکٹر ہی کے ساتھ اچھا پارٹ کرسکتی ہے"۔ کسی نے کہا۔

"وہ ایک بہترین ماہر موسیقی ہے اور ایکٹنگ سے اُسے دور کا تعلق بھی نہیں۔ اُسے نہ دوڑنا آتا ہے نہ بھاگنا۔ نہ مچل سکتی ہے نہ لچک سکتی ہے۔ اور نہ دوسری مشہور ایکٹرسوں کے مقابلے میں اس کی بہادری کے کارنامے کوئی اہمیت رکھتے ہیں" ——— کسی نے کہا۔

"واہ۔ موسیقی تو اُسے چھو کر بھی نہیں نکلی۔ موسیقی کیلئے غنچہ دہنی کی ضرورت ہے۔ اور جب وہ گاتی ہے تو اس کے منہ میں چار انچ قطر کا ایک پورا گلاس آسکتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے ہاتھ اور اُس کا غیر معمولی لمبا قد تعریف اور موسیقیت کے بالکل خلاف ہے۔ اُس کا چہرہ اسکے بالوں سے بھی لمبا ہے۔" کسی نے کہا

"صاحب۔ وہ تو ایک بانس ہے جس پر صرف ساریاں ہی لٹکائی جاسکتی ہیں۔ نہ بنگال کی سی آنکھ نہ بنگال کے سے بال۔ نہ گجرات کی سی کمر نہ پنجاب کی سی تندرستی۔ جب دیکھو بیمار پڑی ہے۔" کسی نے کہا۔

"لوگ جو کچھ بھی کہیں لیکن میرا خیال تو یہ ہے کہ رونے میں اُسے کمال حاصل ہے۔ مرتے وقت

مسٹر سلیم :- گیتی آرا کے متعلق آپ نے جو نسخہ تجویز کیا تھا وہ اسکو برابر استعمال کر رہی ہے۔ اور اب اس کو اظہارِ محبت میں کامیابی حاصل کرنے کا ایسا جنون ہو گیا ہے کہ وہ ہر کسی سے اظہارِ محبت کرنے لگتی ہے۔ آپ یہ سن کر بہت ہنسیں گے کہ کل شب کو میں نے گیتی آرا کو فون کیا اور کہا کہ میں سلیم ہوں اور چند روز کے لئے بمبئی آیا ہوا ہوں۔

سلیم کا نام سنتے ہی وہ چونک پڑی۔ گو اسکو میری آواز کا بھاری پن محسوس ہوا لیکن میں نے یہ کہکر اُسے مطمئن کر دیا کہ مجھے زکام کی شکایت ہے۔ اُس کے پاس بیٹھنے والوں کا بیان ہے کہ اُسکے چہرے پر وہی آثارِ جنون نمایاں ہو گئے جو چھ ماہ پہلے آپ سے گفتگو کرتے وقت دیکھے گئے تھے۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ میرے پاس کیوں تشریف نہیں لائے؟ اب مجھ سے آپ ناامید نہ ہوں گے"۔ میری شرارت دیکھئے کہ میں نے آج کا دن ملاقات کیلئے مقرر کر دیا اور گیارہ بجے اُسکے یہاں جا پہونچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ آئینے خانہ میں گیتی آرا محبت کی مشق کر رہی ہے مجھے دیکھتے ہی پوچھا —— "اور سلیم صاحب کہاں ہیں؟"

آپ ہی بتائیے میں کیا جواب دیتا۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ ابھی آپکی محبت کی مشق پوری نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ تشریف نہیں لائے۔

اب میں اُسے ہزار سمجھاتا ہوں کہ ٹیلیفون پر سلیم صاحب نہ تھے میں نے ہی یہ شرارت کی تھی مگر وہ کسی طرح نہیں مانتی۔ اور کہتی ہے کہ سلیم نے مجھ سے بیوفائی کی۔

کہئیے اب کیا ارادہ ہے۔؟

آپ کا "عامر"

عامر کے اس مکتوب نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں پھر بمبئی جاؤں اور

مشتری تھا۔ اور گیتی آرا کے کردار کو پرکھنے کیلئے اُس کے پاس آیا تھا۔

جب میں اس سے ملا ہوں تو اس کو اپنی اس کمزوری کا احساس ہونے لگا تھا۔ فلم، خطوط، سوسائٹی اور فون کے بعد ملاقات گیتی آرا کے محبت نا آشنا قلب پر ایک بار ثابت ہوئی۔ فلمی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد اخباروں کی مخالفت کو اُس نے اپنے دوسرے نقائص پر محمول کیا تھا۔ وہ جتنا اپنے سدھار کی کوشش کرتی تھی اتنا ہی اُسے پریشان ہونا پڑتا تھا۔ لیکن پرے متعدد مرتبہ کے مطالبے سے اُسے محسوس ہونے لگا کہ اس سے وہ چیز مانگی جا رہی ہے۔ جو اسکو ودیعت ہی نہیں کی گئی۔

میں نے یہاں بھی وہی مطالبہ کیا۔ اسکی روش سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ڈائریکٹر پسِ پردہ اُسکی حرکات کی نگرانی کر رہا ہے۔ اُسکی نظریں جھک گئیں۔ پشیانی سے پریشانی جھلکی۔ الفاظ میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ اور سارے بدن میں سنسناہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ .... میرا مشاہدہ مکمل ہو چکا تھا۔

دوسرے دن میں نے فون پر اُسکو بتایا کہ " میں ایک عرصے سے تمہیں پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور تمام عملی مشاہدوں کی حدود سے گذر کر میرا فیصلہ تمہارے متعلق یہ ہے کہ تم اظہارِ محبت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں "۔

اپنے مستقر پر پہونچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ گیتی آرا محبت کا درس لے رہی ہے اور اکثر مشق کے طور پر بہتر کے مجسموں سے اظہارِ محبت کیا کرتی ہے۔

چھ ماہ کے بعد جب میں شملے کی بلند چوٹیوں پر فطرت کے سراپا محبت مناظر میں گم ہو کر اپنی روحانی لذتیں بڑھا رہا تھا۔ بمبئی سے میرے ایک دوست کا خط ملا۔ اُسنے لکھا تھا۔۔۔

نوادرِ روح

روحوں کی دنیا ہماری مادی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ وہ تمام تعینات جو ہم نے خود پر عائد کر لئے ہیں یا فطرت نے ہم پر عائد کر رکھے ہیں روحانی دنیا میں پہونچتے ہی باطل ہو جاتے ہیں۔ وہاں نہ دن ہے نہ رات۔ نہ سکون ہے نہ اضطراب۔ نہ استقلال ہے نہ روانی۔ ممکن ہے ایک انسان جب روحوں سے مخاطب ہو تو اسکو ان تعینات کی ضرورت نہ پڑے۔ لیکن انسانوں سے روحوں کے متعلق باتیں کرنا اور ان خصوصیات کو درمیان میں نہ لانا ایک مافوق الفطرت بات ہے۔

سنا ہے کہ روحیں دن کے شورش کدے میں روپوش رہتی ہیں اور رات کو اپنے احکام کی تعمیل میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اُنکے احکام کی فہرست ظاہری باتوں سے الگ فرائض پر مشتمل ہوتی ہے۔ انھیں انسان کی دنیا پر اختیار نہیں۔ اور نہ انسان کو انپر دسترس حاصل ہے وہ اپنی قوتِ حس کے ذریعے ظاہری دنیا کے معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس روح کی قوتِ حس جتنی کمزور ہوتی ہے اسکو مادی چیزوں سے اتنا ہی کم واسطہ ہوتا ہے یہانتک کہ جب عالم بالا میں کوئی ایسی روح پہونچتی ہے جو اپنے ضمیر و احساس میں کوئی حرکت نہیں رکھتی تو پھر اُس کو دنیا میں بھیجا ہی نہیں جاتا۔ اسطرح مرنے سے پہلے اور مرنے کے بعد دونوں صورتوں میں وہ روح

گیتی آرا کو پہلے فون پر اور پھر "ملاقات کے کمرے" میں آزماؤں کہ اب کیا وہ واقعی محبت یا اظہارِ محبت کر سکتی ہے ؟۔

مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ اب بھی جذبۂ محبت سے اسی طرح خالی ہو گی جس طرح وہ پتھر کا مجسمہ جس پر گیتی آرا مشقِ محبت کرتی رہی ہے۔

کاش اُسے کوئی سمجھا سکتا کہ مشقِ محبت یا محبت پتھروں سے نہیں انسانوں سے کی جاتی ہے۔ جب تک محبت کا عکس دو دلوں سے منعکس ہو کر ایک نیا آئینہ پیدا نہ کرے محبت کا تماشہ نہیں دیکھا جا سکتا ——————،

نووارد روح کی آمد سے تمام روحوں میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس اطمینان میں اضطراب کی ایک جھلک نمایاں تھی اس لئے کہ سب روحیں اس شوق میں انتظار مجسم بنی ہوئی تھیں۔ کہ نووارد روح سے دنیادی زندگی کے متعلق اسکی رائے معلوم کریں۔

اب نووارد روح روحوں کی مجلس کو مخاطب کر رہی تھی ——— میری ہمجنس روحو!

مجھے ذات ایزدی سے حکم ہوا ہے کہ اس عالم میں قدم رکھنے کے بعد میرا پہلا فرض آپ کو مخاطب کرنا ہے۔ گو اس وقت میں آپکی ہمجنس ہوں لیکن باور فرمائے کہ میں اس فضا میں اجنبیت سی محسوس کر رہی ہوں۔ ابھی چند لمحات ہی گذرے ہیں کہ میں نے عالم اجسام سے تعلقات منقطع کئے ہیں۔ وہ سامنے تازہ قبر اسی انسان کی ہے۔ جسکے جسم میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ گو میں اسوقت آزاد ہوں لیکن میرا احساس اس انسان کی ذات سے ابھی تک وابستہ ہے۔ میں اس انسان کی زندگی پہ تبصرہ کروں گی۔

آپ اسوقت قبر کے وجود اور مجھ میں ایک حدِ فاصل دیکھ رہی ہیں۔ یہی حد زندگی بھر قائم رہی۔ دنیادی زندگی میں اس انسان کے دو وجود تھے۔ ایک تو میرا وجود تھا اور دوسرا اسکی ذاتی خواہشات کا جسے مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گو میں اور مادیت پچیس ۲۵ برس تک ایک ساتھ رہے لیکن ہم دونوں میں کبھی یگانگت پیدا نہ ہوئی۔ اور یہی سبب ہے کہ اب اس انسان کے مرنے کے بعد مجھے اسکے تعلقات سے دلچسپی ہو گئی ہے اور میں اس انسان کو حیرت سے دیکھتی ہوں جو زندگی بھر میری عظمت اور خواہش کو ٹھکراتا رہا۔

اس شخص کا نام سلیم تھا۔ میں اسکے بچپن کا ذکر نہ کروں گی۔ اس لئے کہ بچپن میں بالعموم روحانیت غالب رہتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اسکے ذہن اور دماغ نے مجھ سے بغاوت اختیار کی

ناکامیاب کہی جاتی ہے۔ روحیں اپنی قوتِ حس سے دنیا پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں اور دنیا سے اثر پذیر بھی۔ میں جس روح کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اسکی اس باب میں کیا کیفیت تھی یہ واقعات سے معلوم ہوگا۔

رات کسی گنہگار کے نامۂ اعمال کیطرح سیاہ تھی۔ دن اپنے فرائض کی انجام دہی کے بعد رات کا لبادہ اوڑھے او نگھ رہا تھا۔ کائنات پر اب رات اور رات کی مخلوق کی حکمرانی تھی......

شہر سے بہت دور گورستان کے ایک گوشے میں روحیں ایک نو وارد روح کے استقبال کے لئے جمع تھیں۔ روحوں کا دستور ہے کہ جب فطرت کے کارندے مصروفِ خواب ہوتے ہیں تو یہ ایک جگہ جمع ہو کر اہم معاملات پر تبصرہ کرتی ہیں۔ اگر کوئی نو وارد روح آئی ہو تو پہلے اس سے شناسائی پیدا کیجاتی ہے اور پھر احکام کی تقسیم ہوتی ہے۔ چنانچہ آج کی رات بھی روحوں کو ایک نئی روح کا انتظار تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گورستان میں ایک نئی قبر بنی تھی۔ لیکن نو وارد روح کا کہیں پتہ نہ تھا جب انتظار اپنی حد تک پہونچ چکا تو روحوں میں کسلمندی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور مجلس ملتوی کر دینے کے فیصلے پر غور و خوض ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد فضا میں حرکت ہوئی۔ کائنات کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آسمان پر بادل چھا گئے اور آندھی چلنے لگی۔ لیکن اِن چیزوں کا ذکر بیکار ہے اس لئے کہ روحوں کی مجلس ان باتوں سے اثر پذیر ہونے والی نہ تھی۔ اس آندھی اور اس تاریک فضا سے کم از کم یہ مترشح ضرور ہوتا تھا کہ نو وارد روح کی قوتِ حس اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ نہ صرف کائنات سے وابستہ ہے بلکہ یہ بھی کہ مادّی دنیا سے تعلقات منقطع کرنے کے بعد بھی اسمیں اثر انداز ہونے کی قوت باقی ہے۔

ترقی کا صحیح معیار سمجھتا غرض کہ اسمیں ہر وہ بات پائی جاتی تھی جو ایک مادہ پرست انسان میں ہونی چاہئے۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے تھوڑے عرصے بعد اسکے والد نے اپنا کاروبار اسکے سپرد کر دیا۔ سلیم فہیم تھا۔ سمجھدار تھا اور دنیاوی معاملات کو پوری طرح سمجھتا تھا۔ لیکن میں اس سے ہمیشہ ناراض رہوں گی کہ اس کو میری امداد کبھی حاصل نہ ہوئی۔

سلیم روئی کے کارخانے کا منیجر بنا دیا گیا۔ وہ اب سرمایہ دار تھا۔ اور مزدوروں کا خون چوسنا اب اسکی سرشت تھی۔ اسکو اس بات کی پروا نہ تھی کہ مشین کے چلانے کیلئے اُسکے متعدد پرزوں کا درست ہونا لازمی ہے۔ وہ مشین سے کام لینا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ مشین ٹوٹ کر بالکل ناکارہ ہو جائے۔ مزدور سلیم کی سخت گیری سے نالاں تھے۔ اور سلیم اُنکے جسم کے آخری مادّی تنکے کا خریدار۔

نہ صرف یہ بلکہ اس نے دوسرے سرمایہ داروں کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اور رفتہ رفتہ الگ اپنی ایک جمعیت قائم کر لی جس کا وجود محض مادی بنیادوں پر قائم تھا۔ جمعیت کی کامیابی کا اوّلیں اصول وہ روحانی اسپرٹ ہے جو سب افراد کو ایک حلقے میں منسلک رکھتی ہے۔ لیکن سلیم کے یہاں روحانی اسپرٹ کوئی چیز نہ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اغراض افراد کو ایک جگہ جمع کرتی ہیں۔ اور اغراض کا وجود ہی جمعیت کی بنیاد ہے۔

ایک طرف سرمایہ دار اپنی اغراض کو ایک جگہ جمع کر رہے تھے اور دوسری طرف مزدور اتحاد کے جذبات کے زیر اثر ایک علم کے نیچے کھچتے چلے آتے تھے۔ پہلی صورت مادی تھی اور دوسری روحانی۔ مزدوروں کے اتحاد نے ایک دن شدید صورت اختیار کر لی اور شہر کے سب مزدوروں نے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ کئی جگہ بلوے ہوئے اور گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔

سرمایہ داروں کو انفرادی طور پر اپنی اپنی فکر ہوئی۔ اگر تمام سرمایہ دار ایک جذبے کے ماتحت

اور مجھے اپنے کسی کام میں نمایاں نہ ہونے دیا۔ فطرت نے مجھے مخصوص فرائض دیکر سلیم کے پاس بھیجا تھا۔ بعض اوقات مجھے اسکی حرکات پر بہت افسوس ہوتا لیکن میرا کام صرف رائے دینے کی حد تک محدود تھا اور اس سے آگے سلیم کا کردار اسکی حرکات و سکنات کا ذمہ دار تھا۔

سلیم کا گھرانہ متمول تھا۔ اس لئے اسکو دنیا میں اپنی پوزیشن قائم کرنے کی فکر نہ تھی۔ اور یہی ایک سبب تھا جس نے سلیم کو مجبور کیا کہ وہ روح اور مادے میں ایک حدِ فاصل قائم رکھے سلیم کو اعلیٰ تعلیم دی گئی اور بائیس برس کی عمر میں سلیم نے ایک کامیاب انسان کی حیثیت سے عملی دنیا میں قدم رکھا۔ میں نے اسکی زندگی کو کامیاب کہا ہے۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے اسکی زندگی واقعی کامیاب تھی لیکن روحانی اعتبار سے قطعاً ناکام۔

سلیم تہذیب جدید کا پروردہ تھا۔ اس لئے اس نے اپنے والدین کی ہر اس آرزو کو ٹھکرا دیا جو اسکی روحانی تربیت کیطرف رہنمائی کر سکتی تھی۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد میں سلیم کو ہمیشہ پریشان ہی دیکھتی تھی۔ اس کا دماغ کسی بات سے مطمئن ہی نہ ہوتا تھا۔ اگر سلیم مجھ سے مشورہ لیتا تو یقیناً اسکی زندگی حقیقی معنوں میں کامیاب ہو جاتی۔ لیکن افسوس وہ مادیات میں اسقدر کھویا رہا کہ میں روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی۔ اور بالآخر فطرت نے مجھے آزاد کر دیا۔

سلیم اپنی قوم کی اصلاح چاہتا تھا۔ لیکن اصلاح کا مفہوم اسکے ذہن میں اس مفہوم سے بالکل مختلف تھا۔ جو ایک جہاں دیدہ انسان کے ذہن میں ہونا چاہئے۔ وہ اجتماعی زندگی کی ضروریات پر مصروفِ غور رہتا اور چاہتا تھا کہ وہ شاہراہِ حیات میں نئی روشیں قائم کرے اور فطرت سے انسان کا رشتہ نئے اصولوں پر جوڑے۔ وہ بڑی بڑی پارکوں میں اپنی قوم کی عظمت کو مسکراتے ہوئے دیکھتا۔ وہ مشینوں میں اپنی قوم کے مزدوروں کو الجھا ہوا دیکھتا

سلیم نے پولیس کو اشارہ کیا کہ بوڑھے کو سزا دے کر نکال دیا جائے۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد سلیم کے کان آہ و زاری سے آشنا ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ وہ دردناک آوازرات کے سناٹے میں غائب ہو گئی۔

سلیم اس وقت اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ اس کو میرے وجود کا احساس ہوا۔ اس کے ضمیر نے اُسے ملامت کی۔ اور اُسکے ذہن میں مزدوروں کی تصویریں رقص کرنے لگیں۔ یہ لمحات اسکی زندگی کے بہترین لمحات تھے اور میں اپنے وجود پہ نازش کر رہی تھی۔ زندگی بھر کمزور رہنے کے بعد اسوقت میں نے ایک نئی قوت محسوس کی۔ سلیم کسی خیال سے متاثر ہو کر اپنے کمرے سے نکلا اور دبے پاؤں چلا۔ سپاہیوں کو بھی اسکے جانیکا علم نہوا۔ سلیم اپنے خیالات میں محو سیدھا اُسی بوڑھے کے جھونپڑے میں پہونچ گیا ——— بوڑھا اپنے بچوں سمیت جھونپڑے کے ایک گوشے میں لیٹا ہوا سپاہیوں کو بددعائے رہا تھا۔ اُس نے جب سلیم کو جھونپڑے میں دیکھا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا ——— سلیم اپنے کیے پر پشیمان تھا ——— بوڑھے نے اس کو دعا دی۔ اور سلیم اسی طوفانِ ندامت میں کھویا ہوا اپنے گھر کی طرف لوٹ آیا۔

فطرت کا قاعدہ ہے کہ وہ ابتدا میں انسان کی خطا ئیں آزاد رکھتی ہے اور اس کے کسی فعل پر مواخذہ نہیں کرتی۔ لیکن جب کوئی انسان خود بخود اپنے افعال پر نادم ہو کر فطرت کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اسکو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اور پھر کائنات میں اس انسان کیلئے گنجائش نہیں رہتی ———

سلیم گھر پہونچ گیا اور اندر داخل ہوا۔ ایک سپاہی نے تاریکی میں ایک سائے کو جاتے دیکھا۔ اور ٹوکا ——— لیکن سلیم اسوقت سلیم نہ تھا بلکہ اس کا تمام تر جسم روحانیت

آپس میں اتحاد رکھتے تو یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوتی۔ لیکن اغراض اور ضرورت سب سے بڑے جذبے تھے۔ آخر صورتِ حالات یہاں تک پہونچی کہ رفتہ رفتہ سرمایہ داروں کی مشترکہ زنجیر ٹوٹنا شروع ہوئی۔ اور ہر سرمایہ دار نے انفرادی طور پر اپنا اپنا معاملہ طے کرنا چاہا۔ لیکن دوسری طرف مزدور روحانی جذبات کے ماتحت جمع رہتے تھے۔ اُن کے مطالبات بھی متحد تھے اس لئے اُن پر کسی غرض اور کسی لالچ کا دباؤ نہ پڑا۔

اس ہنگامے میں سلیم بہت سرخوش تھا۔ وہ اس حالت کو اپنی کامیابی کی معراج سمجھتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر ایک دفعہ مزدوروں کو کچل دیا گیا تو پھر کبھی اُن کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی۔ وہ انھیں خیالات میں اپنے برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ مزدوروں کی ایک جمعیت اُسکے پاس آئی۔ سلیم نے اُن سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اُن کے اصرار نے سلیم کو مجبور کیا کہ وہ پولس کو بلا کر سب کو بلوے کے الزام میں قید کرا دے۔ سلیم کے مکان پر پولس کا پہرہ تھا۔ اور اب اُسکی زندگی فرشتوں کی بجائے انسانوں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔

جب کوئی انسان اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے تو روح سمٹ کر جسم کے ایک گوشے میں منکشف ہو جاتی ہے۔ اور اس انسان کو روحانی دنیا کی کسی مخلوق کی ہمدردی حاصل نہیں رہتی۔ یہی حال سلیم کا تھا۔ میں پسِ پردہ افسوس کر رہی تھی اور سلیم کے انجام پر ماتم کناں تھی۔

اسی دن مغرب کے بعد سلیم کو معلوم ہوا کہ کوئی بوڑھا اُس سے ملنا چاہتا ہے۔ سلیم اپنے جھروکے سے جھانکا۔ ایک بوڑھا اور اُس کے ساتھ تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بوڑھے کا جوان بیٹا فریادیوں میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اور بوڑھا فریاد لے کر سلیم کے پاس آیا تھا۔

اسی مصنف کے قلم سے

حُسن کار

فنونِ لطیفہ پر ایک سیر حاصل بحث۔ شاعری، مصوری، موسیقی، اور تعمیر کے متعلق معلومات و نظریات کا ایک نقشِ جمیل۔ کتاب کی زبان بجائے خود ایک آرٹ۔ طلبائے مدارس کے لئے عموماً اور آرٹ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے خصوصاً قابلِ مطالعہ۔ اخباروں اور رسالوں نے اس کتاب پر نہایت حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں۔ تین دیباچے، مرزا انجم آفندی اکبرآبادی، مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے اور پروفیسر احمد علی ایم۔ اے کے قلم سے مع تصویرِ مصنف شریکِ کتاب ہیں۔ قیمت ۶ر علاوہ محصول۔

صبحِ مشرق

جناب ضیا چنیوٹوی کی غزلوں اور نظموں کا بے نظیر مجموعہ۔ ضیا کی شاعری کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی کے عزیز شاگرد اور تربیت یافتہ ہیں۔ آگرہ اسکول کے بہترین نمائندہ اور ادبیات میں ایک خاص کریکٹر کے حامل ہیں۔ "صبحِ مشرق" اپنی خصوصیات کے لحاظ سے عہدِ موجود کا ایک بالکل نیا کارنامہ ہے۔ شاعری کیلئے ایک جدید شاہراہ ہے۔ اور نوجوانانِ وطن کے لئے ایک اچھوتا پیغام (زیرِ طبع) ملنے کا پتہ:-

دفتر شاعر۔ قصر الادب۔ آگرہ

میں بھیگا ہوا تھا۔ اس لئے اس کو مادی آواز سنائی نہ دی۔ سپاہی نے تین مرتبہ آواز دی ——— مگر بے سود!

اب سلیم کھلے ہوئے صحن سے گذر کر برآمدے میں قدم رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے پہلا قدم سیڑھیوں پر رکھا ہی تھا کہ سپاہی کی گولی سنسناتی ہوئی اُس کے سینے سے پار نکل گئی ....

آسمان پر سپیدۂ صبح کے آثار جھلکنے لگے۔ اور دوشیزۂ سحر حریم افق سے انگڑائیاں لیتی ہوئی نکلی۔

ایک بوڑھا اپنے بچوں سمیت ایک تازہ قبر پر سر رکھے حسرت و یاس کا مجسمہ بنا ہوا تھا ——— اور روحیں ایک دوسرے کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے دیکھتے غائب ہو رہی تھیں۔

حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی کے دو شاہکار

کارِ امروز

اسمیں مولانا کی وہ تمام نظمیں موجود ہیں جو ۱۹۳۲ء تک کہی گئی تہیں۔ ہر نظم اپنے اندر حیاتِ قومی کے آثار پنہاں رکھتی ہے۔ ہر نظم محبت۔ اور صداقت کا ایک دلنشیں پیغام ہے۔ ادبِ اردو میں "کارِ امروز" ایک نیا اور تاریخی اضافہ ہے۔ اسکی ایک ہی نظم "ارضِ تاج" ایک ایسا ماسٹر پیس ہے جس پر مولانا کو "شاعرِ تاج" کا خطاب اہلِ قلم اور نامہ [illegible] سے ملا ہے۔ اپنے لئے، اپنے بچوں، عورتوں کے لئے یہ نایاب مجموعہ آج ہی منگوا لیجئے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ مجلد، دو روپیہ غیر مجلد عہ/ علاوہ محصول۔ مع تصویر مصنف۔

حجم ۲۵۶ صفحات

کلیم عجم

یہ حضرت مولانا مدظلہ کا دیوان غزلیات ہے۔ جس کا انتظار سالہا سال سے کیا جا رہا تھا مولانا کو متغزلین اردو میں جو فائق و ممتاز درجہ خدا کے فضل و کرم سے ملا ہے وہ تمام ہندوستان کو معلوم ہے۔ مولانا کی غزلیں، ادبِ اردو میں اجتہادی کارنامے ہیں۔ میر اور غالب کے بعد سرزمین آگرہ سے مولانا سیماب کی تخلیق نے اکبر آباد کی شاعر خیز خاک کی تاریخی عظمت پر مہرِ صداقت لگا دی ہے۔ دیوان کے ساتھ ہی وہ چودہا خطبے بھی ہیں جو مولانا نے مختلف شاعروں میں پڑھے ہیں۔ مع تصویر مصنف۔ حجم ۴۰۰ صفحات، قیمت مجلد سے/ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ:-

ناظم قصر الادب۔ دفتر "شاعر" آگرہ